حرفِ شیریں
مولانا نور عالم خلیل امینی

حرفِ شیریں

انتساب :

استاذِ جیل و مربی جلیل حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ (متوفی ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۵ء) کے نام ؛ جنھوں نے عربی زبان اور دارالعلوم دیو بند کے عشقِ لازوال سے عقل کو سرشار، قلب کو بے تاب اور فکر و نظر کو تابناک بنادیا ـــــ اور زندہ و تابندہ و پائندہ زبان کی حیثیت سے، دارالعلوم دیو بند میں عربی زبان کی لے کو بڑھا کر، ساری نسلِ نو اور تاریخِ دارالعلوم پر احسان کیا ـــــ اور مثالی تعلیم و تربیت کے حوالے سے جن کی زبانِ حال اُن کی سعیِ پیہم و تگ و تازِ مسلسل و بے تابیِ بے کراں کی اِس طرح ترجمانی کر گئی ؂

ضمیر لالہ میں روشن، چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو، شہیدِ جستجو کر دے

حرفِ شیریں

عربی زبان وادب کی ایک بزم میں کی گئی، ایک اہم اور دراز نفس تقریر؛ جس میں عربی زبان کی اہمیت، اس کو تحریرًا وتقریرًا سیکھنے کے طریقوں، جملہ نگاری سے مضمون نگاری تک کی منزلوں، عربی کو عربوں کے لہجے میں بولنے کی تدبیروں، خوش خطی کے فوائد، بدخطی کے نقصانات، تحریر کی مختلف شکلوں کے حوالے سے علمائے نفسیات کے اخذ کردہ نتیجوں، عربی اور اردو میں عصرِ حاضر میں استعمال کردہ رموزِ اوقاف، عربی میں ہمزے کی کتابت کے ضروری قواعد وامثال، عربی عبارت کو صرفی ونحوی غلطی سے پاک کرنے کی راہوں؛ کی دلچسپ، پرلطف اور برجستہ انداز میں نشان دہی کی گئی ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ زبان وادب کے تمام شائقین کے لیے ایک تحفہ، پیغام اور ناگزیر ضرورت ہے۔

مولانا نور عالم خلیل امینی

استاذ ادبِ عربی و مدیر ماہ نامہ "الداعي"
دارالعلوم ، دیوبند، یوپی

"HARFE SHIRIN"
By: MAULANA NOOR ALAM K. AMINI

پہلا ایڈیشن	:	ربیع الاول	۱۴۱۸ھ	-	جولائی	۱۹۹۷ء
دوسرا ایڈیشن	:	جمادی الاولیٰ	۱۴۱۸ھ	-	ستمبر	۱۹۹۷ء
تیسرا ایڈیشن	:	جمادی الاخری	۱۴۱۸ھ	-	اکتوبر	۱۹۹۷ء
چوتھا ایڈیشن	:	ذی قعدہ	۱۴۱۸ھ	-	مارچ	۱۹۹۸ء
پانچواں ایڈیشن	:	ربیع الثانی	۱۴۲۲ھ	-	جولائی	۲۰۰۱ء
چھٹا ایڈیشن	:	محرم	۱۴۲۵ھ	-	مارچ	۲۰۰۴ء
ساتواں ایڈیشن	:	شعبان	۱۴۲۷ھ	-	ستمبر	۲۰۰۶ء
آٹھواں ایڈیشن	:	ربیع الثانی	۱۴۲۹ھ	-	اپریل	۲۰۰۸ء
نوواں ایڈیشن	:	ذی قعدہ	۱۴۳۰ھ	-	نومبر	۲۰۰۹ء
دسواں ایڈیشن	:	ذی قعدہ	۱۴۳۱ھ	-	نومبر	۲۰۱۰ء
گیارھواں ایڈیشن	:	جمادی الاخری	۱۴۳۲ھ	-	مئی	۲۰۱۱ء

نام کتاب : حرفِ شیریں
مرتب : مولانا نور عالم خلیل امینی
ناشر : ادارۂ علم وادب، افریقی منزل قدیم، نزدِ چھتہ مسجد، دیوبند، یوپی
قیمت :

PUBLISHER:
IDARA ILM - O - ADAB
AFRIQI MANZIL QADIM, NEAR CHHATTA MASJID
DEOBAND - 247554 (U.P.) Ph. : (01336)222188
Mobile : 09412508283
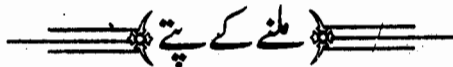
* کتب خانہ حسینیہ، دیوبند، یوپی، فون: 223266 (01336)
* کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، یوپی، فون: 223294 (01336)
* دگر کتب خانہ ہائے دیوبند
* کتب خانہ رشیدیہ، جامع مسجد، دہلی ۶

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود!

عربی زبان حقیقتِ اسلام کا جزوِ لاینفک ہے

(ایک عربی اسلامی اہلِ قلم)

" يعتقد المسلمون بحقٍّ أنَّ لغتَهُمْ العربيةَ جزءٌ لاينفكّ من حقيقة الإسلام ؛ لأنّها كانتْ ترجماناً لوحي الله ، و لغةً لكتابه ، و معجزةً لرسوله ، و لساناً لدعوته . ثم هَذَّبَها النبيُّ الكريمُ بحديثه ، و نشرها الدينُ بانتشاره ، و خَلَّدَهَا القرآنُ بخلودِهِ ؛ فالقرآنُ لا يُسَمَّىٰ قرآناً إلاّ منها ، والصلاةُ لا تكون صلاةً إلاّ بها "

مسلمان بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عربی زبان، حقیقت اسلام کا جزولاینفک ہے ؛ کیوں کہ عربی زبان وحیِ الٰہی کی ترجماں، کتابِ الٰہی کی زبان، رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معجزہ، اور آپ کی دعوت کی شارح ہے۔ نبی کریم نے اپنی شانِ گفتگو سے اس کو شائستگی بخشی، اسلام نے اس کو اپنی آفاقیت دی اور قرآنِ پاک نے اس کو اپنی پائندگی عطا کی ہے۔ بغیر عربی زبان کے قرآن، قرآن نہیں اور اس کے بغیر کوئی نماز، نماز نہیں۔"

(مشہور اسلامی مصنف و مفکر استاذ انور الجندی مصری، بحوالہ ایک اسلامی عربی اہل قلم : الفصحیٰ لغۃ القرآن)

فہرست مشمولات

الله
بسم الله الرحمن الرحيم

حرفِ حکایت

اندرونِ احاطۂ دار العلوم، اپنے کمرے میں، سرِ شام میں کسی کتاب کی جستجو میں، اپنے مختصر سے کتب خانے کی ایک الماری کی گرد جھاڑ رہا تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی اور رہ رہ کے ہوتی رہی۔ کمرے کے اندر والی "کٹیا" سے نکل کر میں نے کواڑ جو کھولا تو اچانک جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم مولانا رشید الدین صاحب کے فرزند ارجمند مولانا اشہد سلّمہ، استاذ مدرسۂ مذکور کو موجود پا کر کچھ اچنبھا سا ہوا، کہ وہ اس وقت سابقہ اطلاع اور رابطے کے بغیر یہاں میرے کمرے تک کیسے آپہنچے؟۔

علیک سلیک کے بعد میں نے شانِ نزول معلوم کیا تو اُنھوں نے کہا کہ دو ہفتے بعد ہمارے ہاں "النادی" (عربی انجمن) کا اجلاس ہے، والد صاحب نے باصرار فرمایا ہے کہ آپ بہر صورت اس میں شرکت فرمائیں۔ میں نے اپنے امراض واعذار کی وجہ سے معذرت کی کہ والد ماجد کو میرا سلام کہیے اور میری طرف سے مؤدبانہ گزارش کر دیجیے کہ میں اپنی بیماریوں اور کمزوریوں کی وجہ سے کسی طرح کے جلسے اور بھیڑ والی تقریب میں شرکت نہیں کرتا، تلوے میں ہمیشہ زخم رہتا ہے جو شکر کی وجہ سے مندمل نہیں ہو پاتا، دہلی کے ناگزیر سفر کے علاوہ شاید و باید ہی

کہیں جانا ہوتا ہے۔ اس مرض کی وجہ سے زبان تالو سے چپک جایا کرتی ہے ؛ اس لیے جلسوں اور میٹنگوں میں تقریر وغیرہ کی طاقت بھی نہیں رہی۔ میرے لیے اس سے زیادہ سعادت کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ عربی زبان کے عنوان سے منعقد کردہ کسی جلسے میں شرکت کی جائے اور کچھ وقت کے لیے حواس کو اس شیریں زبان سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔ لیکن اس کے لیے جس ہمت و حوصلے کی ضرورت ہے، بد قسمتی سے میں اب اپنے اندر نہیں پاتا ؛ اس لیے ہمارے احباب میں سے کسی کو لے لیجیے، الحمد للہ ان لوگوں کی ہمت جوان ہے۔ میں نے از خود ہی دار العلوم کے دو تین اساتذۂ گرامی کا نام لیا جو اِس طرح کی تقریبات کے اہل بھی ہیں اور ان میں شرکت بھی کرتے رہتے ہیں۔ عزیز موصوف نے کہا کہ یہ لوگ تو ضرور ہی رہیں گے ؛ لیکن یہ حضرات بار بار تشریف لے جا چکے ہیں، ہم لوگوں کی دلی خواہش ہے کہ آپ محض شرکت فرمائیں اور تفریح کے ارادے سے ہی سہی مراد آباد تشریف لے چلیں، ہم لوگ آپ کو کسی طرح کی زحمت نہیں دیں گے، جلسے میں تقریر کرنی آپ کی مرضی کی بات ہو گی۔

وہ دیر تک بیٹھے مختلف پیرایوں میں مجھے مناتے رہے۔ میں ارادے کا کچا ہوں ؛ چناں چہ ان کے التماسِ مسلسل کے سامنے ہار مان گیا۔ لیکن میں نے ان سے وعدہ کرا لیا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر جلسے میں تقریر کے لیے مجھ پر دباؤ نہیں ڈالیں گے۔ بروقت میں اپنی کیفیت، موڈ، اور ذہنی آمادگی کی روشنی میں از خود فیصلہ کروں گا کہ مجھے کچھ کہنا ہے کہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ ریل سے میں سفر نہیں کروں گا اور نہ

بس سے، کہ مراد آباد کے لیے، خصوصاً یہ دونوں ذرائع سفر موزوں نہیں۔ آپ گاڑی کا انتظام کر کے جائیں اور اس سلسلے کی جو بھی ذمہ داری دینی ہو، وہ میرے مذکورہ احباب ہی کو دے جائیں۔ کسی طرح کی انتظامی الجھن کو اپنے سر لینے سے میری طبیعت بالکلیہ ابا کرتی ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے ہامی بھری اور ایسا ہی کیا۔

جمعرات ۱۳/ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۹/اگست ۱۹۹۶ء کو سوا آٹھ بجے، دارالعلوم کی جیپسی سے، مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصورپوری و مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی: استاذانِ دارالعلوم نیز حافظ اُسامہ سلمہٗ کی رفاقت میں، مراد آباد کے لیے روانہ ہوا۔ دونوں ہی حضرات شریف الطبع، ملنسار، متواضع اور خلیق ہیں؛ اِس لیے یہ سفر خاصا مزے دار، خوش گوار اور یادگار رہا۔ قاری صاحب کا مدرسہ شاہی سے جو گوناگوں تعلق ہے، اس کی بنا پر وہ گویا ہم لوگوں کے میزبان تھے؛ انھوں نے خوش اخلاقی سے یہ ذمہ داری نبھائی۔

مراد آباد کے لیے ہم لوگوں نے، مظفر نگر، بجنور، اور نور پور وغیرہ کا راستہ اختیار کیا۔ برسات کی وجہ سے ہر طرف ہریالی سے گھرے راستے، دونوں طرف ہرے بھرے درخت، لہلہاتی ہوئی گنے، دھان اور جوار کی شاداب کھیتی کی وجہ سے، دل کی کلی راستے بھر کھلتی اور مسکراتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت کے ہاتھوں نے روئے زمین پر گہرے سبز رنگ کی خوش نما اور مسرت بخش چادر بچھادی ہے۔ مجھے طبعی طور پر سبزے کی دل فریبی پیاری اور بھلی لگتی ہے۔ کئی جگہ مصنوعی نہریں راستے کو کراس کرتی ہیں؛ جن کی وجہ سے خوش منظری و سحر طرازی

میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

شب جمعہ ۱۴ / ۴ / ۱۴۱۷ھ = ۳۰ / ۸ / ۱۹۹۶ء کو مغرب کے بعد تقریباً ۱۱ / بجے رات تک جلسہ ہوا، طلبہ کے تقریری پروگراموں کے بعد، ہمارے دونوں احباب نے انھیں قیمتی نصیحتوں سے نوازا۔ دونوں حضرات کے بیچ میں اناؤنسر نے میری توقع اور بوقتِ قبولِ دعوت میرے ساتھ کیے گئے وعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میرے نام کا اعلان کر دیا، تو میں نے اپنی کمزوری کو نظر انداز کرتے ہوے ہمت جوٹائی اور عربی کی تحصیل کے سلسلے میں خدائے پاک کی توفیق سے جو کچھ کہا اس کو ناظرین آئندہ (۱) صفحات میں پڑھیں گے۔

---

(۱) اس لفظ کا املا بعض لوگ "ی" سے "آیندہ" لکھتے ہیں۔ اسی طرح نمایندہ، پایندہ، نمایندگی، شایع، شایق، قایم، دایم، مایل، آزمایش، نمایش، ستایش وغیرہ لکھتے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے، سفارشاتِ املا کمیٹی، ترقی اردو بورڈ پر مشتمل اپنی کتاب "املا نامہ" میں ان الفاظ کے "ی" والے اس املا کو غلط بتایا ہے اور کہا ہے کہ اس کا صحیح املا ہمزے ہی سے ہے، خواہ فارسی یا عربی میں ان کی اصل آیندہ، نمایش، آزمایش، اور قایم ہو، لہٰذا انھیں نمائندگی، سائل، شائع، شائق، قائم، الخ ہی لکھنا چاہیے، کیوں کہ یہی تلفظ ہے اور اسی کا چلن بھی ہے۔

ماہر تعلیم رشید حسن خاں صاحب نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ عربی کے الفاظ سائل، شائع، شائق، قائم، دائم، مائل، حائل، وغیرہ کو ہمزے ہی سے لکھنا چاہیے، لیکن فارسی کے الفاظ: نمایندگی، نمایندہ، آزمایش، نمایش، آسایش، ستایش، وغیرہ کو "ی" سے لکھنا چاہیے؛ اس لیے کہ اس کی فارسی اصل "ی" سے ہے۔

لیکن ان کی بات ناقابلِ التفات ہے؛ کیوں کہ ان کے ہاں اور تمام ماہرینِ املائے اردو کے ہاں یہ بات مسلم ہے کہ اردو الفاظ کو اس کے تلفظ کے اعتبار سے ہی املا کیا جائے گا۔ ان کی اصل کی طرف بدرجہ مجبوری ہی توجہ کی جائے گی، چناں چہ "مولیٰ" کو "مولانا" "ادنیٰ" کو "ادنا" اسی بنیاد پر لکھنے کی سفارش کی گئی ہے ہر چند کہ "مولیٰ" کو "مولانا" تو لکھا جانے لگا ہے؛ لیکن ادنیٰ، اعلیٰ جیسے الفاظ کو کھڑے زبر کے بجائے الف سے "ادنا" اور "اعلا" لکھنے کا چلن نہیں ہو سکا ہے؛ کیوں کہ یہ کچھ عجیب سا لگتا بھی ہے اور "ماہرینِ" املائے اردو کی انتہا پسندی کی دلیل بھی ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ اپنی عمر میں، طلبہ کے کسی جلسے میں، میں نے اتنی طویل گفتگو کی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ خدائے کریم کی مدد کے بعد، میں اسے اپنے داعیوں اور اپنے مخلص احباب و طلبۂ عزیز کی توجہات اور خلوص کا فیضان سمجھتا ہوں۔ مجھے صاف محسوس ہوا کہ کسی بندۂ خدا کی دعائے پُر خلوص و مستجاب میرے ساتھ ہے۔ خاصی گراں قدر باتیں اللہ نے کہلوائیں، طلبۂ عزیز نے غور سے سنیں، جوش و جذبے کی کار فرمائی اور افکار کے بہاؤ نے اُنھیں (۱) بے التفاتی کا کوئی موقع نہیں دیا۔ جلسے کے بعد عزیز محترم مولانا مفتی سید سلمان منصور پوری سلمہ اللہ نے مصافحہ کرتے ہوئے یہ کہہ (۲) کر میرے حوصلے کو تقویت دی کہ "حضرت! آج تو حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ کی یاد تازہ ہو گئی!"

---

(۱) "انھیں" اور اس طرح کے الفاظ: تمھیں، جنھیں، تمھارے، ابھی، کبھی، جبھی، سبھی، تمھاری، تمھارا، کمھار، ننھا، ننھیال، گیارھواں، بارھواں، تیرھواں، وغیرہ کو موجودہ ہی شکل میں یعنی ہائے مخلوط (دو چشمی ھ) سے لکھنا چاہیے۔

ان الفاظ کا املا لٹکن والی کہنی دار ہا سے: انہیں، تمہیں، الخ غلط ہے۔

(۲) "کہہ" جو کہنا سے ہے؛ اس کا املا اسی طرح ہوگا۔ البتہ "کہ" بیانیہ، جیسے: "میں نے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟" اس دوسرے لفظ "کہ" کی ہا بغیر لٹکن کے لکھی جائے گی۔ اکثر لوگ غلطی سے "کہنا" کے امر "کہہ" کو کہنی دار "ہ" سے "کہہ" لکھتے ہیں؛ جو غلط ہے؛ اس لیے کہ کہنی دار "ہ" ہمیشہ بیچ میں آتی ہے۔ جیسے: کہنا، سہنا، بہنا، وغیرہ۔ لفظ کے آخر میں کبھی نہیں آتی۔ دوسری غلطی "کہہ" کو "کہہ" لکھنے میں یہ ہے کہ اس طرح دو "ہ" جمع ہو جاتی ہیں: کہنی دار اور دوسری بشکل مد "ہ" اس طرح یہ لفظ سہ حرفی (ک + ہ + ہ = کہہ) بن جاتا ہے، حالاں کہ یہ دو حرفی (ک + ہ = کہ) ہے۔

یہاں دھیان دینے کی بات یہ ہے کہ "ہ" کی تین قسمیں ہیں (الف) ہائے ملفوظ: وہ "ہ" جو تلفظ میں آتی ہے۔ جیسے: وہ، یہ، یہاں، وہاں، کہنا (ب) ہائے مختفی وہ "ہ" جو تلفظ میں نہ آئے بلکہ صرف اپنے سے پہلے کے زبر کو سہارا دے۔ جیسے: مے خانہ، بت خانہ، بندہ، پردہ، وغیرہ (ج) ہائے مخلوط یعنی دو چشمی ہا: ھ۔ جیسے: گھر، دھر، بھر۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس خدا نے مذکورہ گفتگو کا یارا دیا، اسی کی توفیقِ خاص سے، میں نے اپنے حافظے کی مدد سے، شبِ دوشنبہ بعد مغرب : ۱۷/۴/۱۴۱۷ھ مطابق ۲/۹/۱۹۹۶ء، کو اس کو تقریباً من و عن اپنی ڈائری میں نقل کر لیا؛ حالاں کہ عرصے سے میں اب ڈائری لکھنے کی پابندی نہیں کر پاتا کہ تدریسی، تحریری، صحافتی مشاغل اور ان کے ساتھ جسمانی عوارض اِس پابندی کی اجازت نہیں دیتے۔

اتفاق سے بعض اہلِ علم دوستوں کی نگاہ ڈائری کے ان اوراق پر پڑ گئی، تو ان کی رائے ہوئی کہ "یہ قیمتی باتیں طالبانِ زبانِ عربی کے لیے خصوصاً اور طلبۂ مدارسِ عربیہ کے لیے عموماً بے حد مفید ہیں۔ مدرسہ شاہی کے طلبہ خوش قسمت ہیں کہ اُنھوں نے اپنے کانوں سے بالمشافہہ یہ گراں مایہ نصیحتیں سن لیں؛ لیکن دار العلوم دیوبند اور دیگر مدارسِ عربیہ کے طلبہ تو اِن سے محروم رہے، حالاں کہ یہ ان کے لیے بھی اسی طرح ناگزیر ہیں جیسے مدرسہ شاہی کے طلبہ کے لیے؛ اِس لیے اِنھیں کتابی شکل میں چھاپ کر اِن کے فائدے کو عام کیا جائے۔ اِن شاء اللہ یہ ثواب کا کام ہوگا۔"

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ حاشیہ)

ہائے ملفوظ کو جب ملا کر لکھیں گے تو اس کی تین شکلیں تحریر میں آئیں گی: جب شروع میں لکھی جاتی ہے تو "ب" کے شوشے کی طرح لکھی جاتی ہے اور پہچان کے لیے اس کے نیچے لٹکن کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے ہوا، ہمارا؛ جب یہ بیچ میں آتی ہے تو کہنی دار لکھی جاتی ہے۔ جیسے: بہت، کہنا، بہنا، لٹکن اس شکل میں بھی لگے گا جیسا کہ آپ لکھے ہوئے الفاظ میں دیکھ رہے ہیں ـــــ ہائے ملفوظ جب لفظ کے آخر میں، ماقبل حرف سے ملی ہوئی آتی ہے تو اس کی شکل ہائے مختفی ہی کی طرح ہوتی ہے؛ مگر اس کے نیچے کا لٹکن ہی یہ بتائے گا کہ یہ ہائے ملفوظ ہے، ہائے مختفی نہیں۔ جیسے: کہ، جگہ، بیہ، منہ، مہ، سہ، تہ، بہ، مشابہ، شہ، بارگہ، توبہ، فقہ، توجہ، سیہ۔

ان حضرات کے اِصرار کے بعد میرے ذہن نے اسے شائع کرنے کی آمادگی ظاہر کی، تو میں نے مذکورہ تحریر: تقریر کو چھاپنے کے اِرادے سے دوبارہ پڑھی کہ تقریر میں عموماً اختصار، اجمال، ارتجال اور اشاریوں سے کام لیا جاتا ہے۔ تفصیل، توضیح، دیر تک سوچنے، کڑیوں کو مربوط کرنے اور کسی خیال کی تائید کے لیے دلائل و شواہد کو فی الفور جمع کرلانے کا موقع نہیں ہوتا۔

یہ سب کچھ ایک تو کیا نہیں جاسکتا، کہ تقریر کا مزاج اس کی اجازت نہیں دیتا اور اگر کیا جائے تو سامعین کے لیے تقریر گراں گوش ہو جائے گی۔ تقریر کی روانی، تسلسل، جوش، جوڑ، اور سامعین کے لیے دواعیِ التفاتِ قلب: دونوں باتیں ختم ہو جائیں گی۔

بہرکیف اس تقریر کو تحریر کی شکل میں شائع کرنے کے لیے حک و تہذیب کے ساتھ ساتھ اجمال کی ضروری تفصیل، ابہام کی ناگزیر توضیح اور خیالات کی مختلف جگہ لابدی تائید کی گئی ہے، جس سے اس کی افادیت میں الحمدللہ اضافہ ہو گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

عربی زبان کی تحصیل کی دو سطحیں ہیں: (الف) صرفی و نحوی طور پر عربی کو اچھی طرح سمجھنا اور اس لائق ہو جانا کہ مشکل سے مشکل عبارت کو حل کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہو (ب) اول الذکر صلاحیت کے ساتھ ساتھ لکھنے اور بولنے کی استعداد حاصل کرلی جائے۔ دونوں کی وضاحت کے بعد کہا گیا ہے کہ پہلی سطح کی عربی جاننا مدارسِ عربیہ

کے ہر طالب علم پر فرض ہے۔ اِس کے بغیر کتاب و سنت کے علوم کو اس کے مصادر اصلیہ سے سمجھنا خارج از امکان ہے ؛ جب کہ مدارس میں تحصیلِ علم اور حصولِ سندِ فراغ کا یہی اولین اور بنیادی مقصد ہے۔ اس خصوص میں طلبہ کو پُر درد لہجے میں جھنجھوڑا گیا ہے۔ امید ہے کہ طلبہ اِس سے متاثر ہوں گے۔

پھر اِس دوسری سطح پر عربی زبان کی تحصیل کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے حالات کے تقاضے کے چوکھٹے میں زبان و ادب کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نمبروار ہدایات ذکر کی گئی ہیں ؛ جن کی روشنی میں اس سطح کی عربی کا سیکھنا آسان ہو سکتا ہے اور اس کے سیکھنے سے جو فائدہ اٹھانا چاہیے، اٹھایا جا سکتا ہے۔

۱- پہلی ہدایت کا خلاصہ یہ ہے کہ زبان کو بولنے کی سطح پر بھی حاصل کرنا چاہیے : یہ کیوں کر ممکن ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

۲- زبان کو ”تحریراً“ یعنی مضمون نگاری، انشاء پردازی اور تصنیف و تالیف کی سطح پر بھی سیکھنا ضروری ہے، بلکہ یہی اصل سطح ہے ؛ کوئی صرف بولنا سیکھ لے، تو زبان کا سیکھنا نہیں کہا جائے گا۔ اول الذکر سطح کا فائدہ ہنگامی ہوتا ہے، جب کہ ثانی الذکر سطح کی افادیت دیرپا اور دوررس ہوتی ہے۔ تحریراً سیکھنے کے لیے ”جملہ نگاری سے مضمون نگاری تک“ کے ذیلی عنوان کے تحت بہت کار آمد اصول ذکر کیے گئے ہیں ؛ جن کا جاننا اور ان پر کاربند ہونا عربی زبان کے ہر طالبِ علم کے لیے ضروری ہے۔ خدائے کریم اُنھیں اس کی توفیق بخشے۔

۳- تیسری ہدایت کا تعلق اِملا سے ہے۔اس کی اہمیت، افادیت، ضرورت، اور تقاضے پر زور دیا گیا ہے۔ عربی زبان کے طالبِ علم کے لیے خصوصاًاور زبان وادب کے راہ رو کے لیے عموماًاس کی کتنی ضرورت ہے ؟اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے عربی زبان میں ہمزے کی لکھاوٹ کے طریقوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری قواعدوضوابط مثالوں کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔ ہمزۂ وصلی اور قطعی کے لکھنے کا فرق بھی بتایا گیا ہے۔

اس ہدایت کا سب سے دلچسپ حصہ ''رموزِاوقاف'' کے استعمال سے متعلق ہے،جو قدرے مفصل ہے۔ اردو، عربی، اور انگریزی میں ''رموزِاوقاف'' کے نام اور ان کے جاہائے استعمال کو تعریفوں اور مثالوں سے واضح کیا گیا ہے.

مثالیں، عربی، اور اردو : دونوں زبانوں میں ساتھ ساتھ دی گئی ہیں تاکہ عربی کے طلبہ کے ساتھ ساتھ اردو کے شائقین بھی فائدہ اٹھاسکیں۔ یہ اِس لیے کیا گیا ہے کہ راقم الحروف عربی کے طلبہ کو ہمیشہ اردو زبان میں مہارت بہم پہونچانے کی دعوت دیتا رہتا ہے۔ یقیناً طلبہ کے لیے یہ حصہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ اور وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر مدرسوں کے ماحول میں وہ خود بھی اس کے داعی بن جائیں گے۔

۴- چوتھی ہدایت، تلفظ اور صحتِ ادا سے متعلق ہے۔اس کے بغیر الفاظ مسخ ہو جاتے ہیں اور سننے والا کہنے والے کے مقصد کے برخلاف

سنتا اور سمجھتا ہے۔

۵- پانچویں ہدایت حسنِ تحریر کے سلسلے میں ہے۔ نویسندہ کی بد خطی کیا کیا گل کھلاتی ہے؟ اِس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی ہمیشہ اور ہر جگہ ضرورت رہی ہے، اور رہے گی۔ پھر "حسنِ خط کے چند زریں فائدے" کے ذیلی عنوان کے تحت، خوش خطی کے فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو سبق آموز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

خوش خطی، بد خطی، سطروں کی کجی، نیچے سے اوپر کو جاتی ہوئی سطریں، اوپر سے نیچے کو لڑھکتی ہوئی سطریں، حروف کی ایستادگی، ان کی باریکی اور موٹاپا، متوازن الحروف تحریر، غیر متناسب الحروف تحریر: سے علمائے نفسیات نے کیا نتیجہ نکالا ہے؟ حاشیے میں، ابجد، ہوّز، والے نمبرات کے تحت ضرور پڑھیے۔ یہ نتیجے عبرت خیز بھی ہیں اور باعثِ نشاط و سرور بھی۔

اِسی ہدایت کے تحت ضمناً "ایک ضروری وضاحت" کے عنوان کے تحت، چندے کے مدارس یا مکاتب کے قیام کے حوالے سے اکابر کا نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے، جس کی ہر سطر دل سوزی و خلوص سے لبریز ہے۔ توقع ہے کہ یہ سطریں طلبہ کی خاص توجہ کو اپنی طرف مبذول کرائیں گی۔

۶- عربی عبارت کو صرفی و نحوی غلطی سے پاک کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، اس موضوع پر دو ایک سبق آموز لطیفے بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

۷- ساتویں بات عربوں کی زبان کو عربوں کے لہجے میں بولنے

کی نقل کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ صحتِ ادا سے علاحدہ ایک مستقل ضروری ہدایت ہے۔ یہ حصہ خاصا کیف آور اور نشاط انگیز ہے: لطیفے بھی ہیں، واقعات بھی اور عبرت خیز حکایات بھی۔

☆ ☆ ☆

آخری بات یہ کہ خدائے علیم وخبیر کو گواہ بنا کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان سطروں میں آپ جو کچھ پڑھیں گے وہ در حقیقت سوزِ نہاں کی صورت گری، ربطِ دل کی آواز، اور خلوصِ قلب کی نقش نگاری ہے۔ لہٰذا اگر اس سے آپ کے دل پر کوئی دستک ہو، تو آپ دعا کیجیے کہ یہی سرمایۂ نجات اور باعثِ سعادتِ حیات ہے اور اگر دل کے آبگینے کو کوئی ٹھیس لگے تو تلخیِ حق کو پی جایئے، کہ یہ میں نے صرف آپ کی محبت میں کہا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ شادکام رہیں گے، سرخ رو رہیں گے اور کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ وفغاں نیز کنند

نور عالم خلیل امینی
افریقی منزل قدیم، دارالعلوم دیوبند
جمعہ: ۲۱/ صفر ۱۴۱۸ھ
۲۷/ جون ۱۹۹۷ء
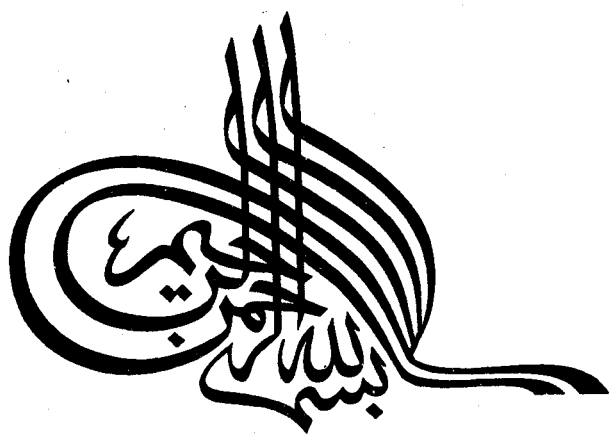
ضروری تمہید

نمازِ مغرب کے بعد تقریباً ساڑھے سات - پونے آٹھ بجے جلسہ شروع ہوا۔ جلسے میں دیگر مدارس کے متعدد علما نے بھی شرکت کی۔ مولانا رشید الدین صاحب مہتمم مدرسہ شاہی، اپنے جسمانی عوارض اور تکلیفوں کے باوجود ساڑھے گیارہ بجے تک موجود رہے۔

طلبہ نے تقریروں، محادثوں، ترانوں اور تلاوتِ قرآن پاک کا اچھا مظاہرہ کیا۔ عربی کے تمام پروگرام خوش اسلوبی سے پیش کیے۔ ساڑھے نو بجے طلبہ اپنے پروگرام سے فارغ ہوئے تو پھر ہم لوگوں کی باری آئی۔ سب سے پہلے ذمے دار طلبہ نے قاری محمد عثمان صاحب کو زحمتِ سخن دی۔ انھوں نے دس بجے تک تقریباً آدھا گھنٹہ عربی زبان میں "اغتموا خمسًا قبل خمس" والی حدیث کی روشنی میں، طلبہ کو نصیحت کی۔ ساتھ ہی فرمایا کہ عربی زبان سیکھ کر بعض طلبہ ناسمجھی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے غرورِ بے جا کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے ان اساتذہ کو ہیچ سمجھنے لگتے ہیں جو عربی زبان میں گفتگو اور تقریر پر قادر نہیں ہوتے اور رواں عربی لکھنے کی مشق نہیں کی ہوتی ہے؛ تو طلبہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

اِس کے بعد میرے مرض اور کمزوری کا لحاظ کیے بغیر (جس کا علم طلبہ کو تھا اور میں نے مولانا اشہد کو بوقتِ دعوتِ شرکت در تقریب ہٰذا، تاکید کر دی تھی کہ مجھے تقریر کرنے پر آپ مجبور نہیں کریں گے،

البتہ بروقت مجھ سے میری حالت پوچھ کر میری اجازت کے بعد، تقریر کا اعلان کرا سکتے ہیں) طلبہ نے میری توقع کے برخلاف مولانا عبدالخالق کا نام پیش نہ کر کے، تقریر کے لیے میرے نام کا اعلان کر دیا۔ ناچار میں تقریر کے لیے کرسی پر آگیا، ایک صاحب پانی لے کر میرے بغل میں بیٹھ گئے؛ کیوں کہ میں دورانِ تدریس و تقریر ہر چند منٹ کے بعد پانی کا ایک دو گھونٹ لیے بغیر بول نہیں پاتا، زبان تالو سے چپکنے لگتی ہے۔

خدا کی توفیق سے پہلے عربی زبان میں کچھ کہا گیا پھر اردو زبان میں۔ عربی میں حمد و صلاۃ کے بعد کہا گیا کہ صدر جلسہ، اساتذہ حضرات اور عزیز طلبہ! میں عربی زبان میں آپ لوگوں کے سامنے دو تین وجوہات کی بنا پر بولنے سے معذرت خواہ ہوں۔ ایک تو مرض کی وجہ سے میں خاصا گھل گیا ہوں بلکہ اندر سے کھوکھلا سا ہو چکا ہوں، زبان طویل گفتگو کے وقت لڑکھڑانے لگتی ہے اور دائیں بائیں حسب ضرورت بعض دفعہ نہیں مڑپاتی؛ اس لیے میں اردو میں کوئی طویل گفتگو نہیں کر پاتا چہ جائے کہ عربی میں۔ عربی زبان کے الفاظ اور جملے اردو کی بہ نسبت بھاری، پر شکوہ اور ہم عجمیوں کے لیے ثقیل الادا ہیں؛ اس لیے بہ نسبت اردو کے عربی میں بولنا میرے لیے اور بھی گراں بار ہوا کرتا ہے۔ دوسری وجہ آپ لوگوں کے سامنے عربی میں بولنے سے گریز کی، یہ ہے کہ میں کسی ایسے مجمع میں، جس میں سارے کے سارے سامعین عجمی ہوں اور اس میں ایک بھی عربی نہ ہو؛ جب عربی میں بولتا ہوں، تو میں کچھ عجیب طرح کے احساسات میں گرفتار ہو جاتا ہوں: مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی امتحان دے رہا ہوں، جیسے کوئی نمائش کر رہا ہوں، جیسے مدح سرائی

کے حصول کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ عربوں کے سامنے عربی میں بولنا، ایک مجبوری ہے۔ لیکن غیر عربوں کے سامنے، جو اردو میں کسی بات کو زیادہ ہضم کر سکتے ہوں اور میں اس میں عربی کی بہ نسبت، زیادہ بہتر طریقے سے خیال کو ادا کر سکتا ہوں، عربی میں بولنے کی کون سی مجبوری ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقع پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے اور میرا احساس دامن گیر ہو جاتا ہے کہ عربی میں تم کیوں بول رہے ہو جب کہ یہ مجمع اسے صحیح اور مکمل طور پر نہیں سمجھ رہا اور تم بھی اردو میں اس بات کو زیادہ خوش اسلوبی سے ادا کر سکتے ہو؟۔

عربی زبان میں؛ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے، گفتگو کرنے سے اس جیسی تقریب کے مواقع پر جو چیز مانع ہوا کرتی ہے، وہ یہ احساس ہے کہ میں اس وقت ان عزیز طلبہ کے سامنے ان کے لیے کچھ مفید نصائح اور موضوع سے متعلق باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ عربی میں یہ لوگ کماحقہ سمجھ نہیں سکتے؛ اس لیے کیا ہی اچھا ہو کہ آپ لوگوں کے سامنے اردو میں بات کی جائے، تاکہ مطلوبہ فائدے کا حصول یقینی بن جائے۔

اس لیے میرے عزیز طلبہ اور محترم مولانا عثمان صاحب نیز مدرسہ شاہی کے بعض عربی زبان وادب کے اساتذہ کے برخلاف، جنھوں نے عربی میں گفتگو کرنے کی پابندی کی اور عربی جلسے کی روایت سے انحراف نہیں کیا؛ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس پابندی سے آزاد ہونے کے "گناہ" کا ارتکاب کروں اور آپ لوگوں کے سامنے ضروری باتیں اردو زبان میں عرض کروں؛ تاکہ آپ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔

اس موقع سے میں نے عربی کی بعض ان تعبیروں کی طرف بھی اشارہ کیا جنھیں طلبہ عام طور پر استعمال کرتے ہیں حالاں کہ وہ درحقیقت عربی تعبیریں نہیں، بلکہ اردو کا ترجمہ محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے طلبہ کہتے ہیں: الأسف فوق الأسف اس کی صحیح عربی "یُؤْسِفُنی جدا" یا "مما یُؤسَفُ لَهُ جدًا" ہوگی۔ اسی طرح طلبہ "نحن طلابُ الجامعة سنقیم مباراةً فی کرۃ القدم" کہتے ہیں۔ اور "طلاب" کے لفظ کو رفع دیتے ہیں؛ جو غلط ہے۔ اس طرح کی ترکیب میں نحن کے بعد والا اسم ظاہر ہمیشہ منصوب ہوگا؛ کیوں کہ یہ نصب، تخصیص کا ہے یا مدح کا ہے۔ نحن کی خبر "سنقیم الخ" ہے "طلابُ الجامعة" اس کی خبر نہیں ہے جب کہ طلبہ غلطی سے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے اردو میں گفتگو شروع کی جس میں، میں نے سب سے پہلے عربی کی اپنی گفتگو کے بعض ضروری حصوں کو اردو میں کہا، پھر میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ان طلبہ کو جو شریکِ پروگرام ہوئے تھے شاباشی دی اور کہا کہ آپ لوگوں نے خاصی محنت کی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اساتذہ نے بھی آپ لوگوں سے خوب محنت کرائی ہے۔ آپ اپنی محنت اسی طرح بلکہ اس سے بہتر طور پر جاری رکھیے، ان شاء اللہ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

تحصیلِ عربی زبان کے دو پہلو

میں نے کہا کہ آپ میں سے اکثر طلبہ کی تقریروں سے اندازہ ہوا کہ آپ لوگوں کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ طلبہ دس دس سال

عربی میڈیم ہی میں ساری کتابیں پڑھتے ہیں، لیکن انھیں عربی بولنا اور لکھنا نہیں آتی ؛ جو ایک افسوسناک صورتِ حال ہے۔ آپ کا یہ احساس مبارک احساس ہے، کسی زبان کا احساس ہی انسان کو راہِ کامیابی و ترقی پر ڈالتا ہے۔ یہ احساس اگر کسی فرد یا معاشرے سے چھین لیا جائے، تو یہ اس کی بڑی بد قسمتی ہو گی۔

لیکن عربی زبان سیکھنے کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ آپ کی صرف و نحو درست ہو اور آپ عبارت خوانی و عبارت فہمی میں کوئی غلطی نہ کریں۔ آپ عبارت کے تمام پیچ وخم سے واقف ہوں اور نتیجتاً آپ مطالب و معانی کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور غلط کو خود ہی صحیح کر سکیں، کوئی غلط فہم آپ کو غلط مطلب کے مان لینے پر مجبور نہ کر سکے ؛ خواہ آپ عربی کو لکھ اور بول نہ سکیں، کہ اس کا تعلق مشق سے ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ عربی صرف و نحو اچھی طرح جانتے ہوں، عبارت کی تمام خوبیوں اور خرابیوں سے واقف ہوں اور اس کی ہر گرہ آپ کھول سکتے ہوں، اِسی کے ساتھ ساتھ آپ عربی میں اچھی طرح لکھ بھی سکتے ہوں اور بول بھی سکتے ہوں اور تصنیف و تالیف بھی کر سکتے ہوں۔

اول الذکر سطح تک کی عربی جاننا ہر اس طالب علم کے لیے فرض ہے جو دینی علم کے حصول کے لیے کسی اسلامی مدرسے(۱) میں داخل

---

(۱) "مدرسے" اِس کے آخر میں ہائے مختفی تھی: "مدرسہ" جو مُحَرَّف شکل میں "ے" سے بولی اور لکھی جاتی ہے۔ پہلے یہ ہر حال میں "ہ" ہی لکھی جاتی تھی، البتہ بولی "ے" سے جاتی تھی؛ لیکن اب تمام ماہرینِ املا کا اتفاق ہے کہ جس طرح بولی جاتی ہے اسی طرح لکھی جانی چاہیے۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو وہ کسی عبارت کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی مطلب تک از خود رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اگر کوئی کم علم یا کم فہم بلکہ بد فہم کوئی غلط مطلب کسی عبارت کا، بتا اور سمجھا دے، تو اس غلطی کو بھی وہ معلوم نہیں کر سکتا؛ کیوں کہ عبارت فہمی ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے کسی عبارت کے غلط یا صحیح مطلب میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی طالب علم کی ننانوے فیصد کامیابی یہی ہے کہ وہ عبارت کو اس حد تک ضرور سمجھ لے۔ اس کے بغیر دینی تعلیم کا حصول، کتاب و سنت کی صحیح جان کاری اور شرعی علوم کا اکتساب، ایک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔

فہمِ زبانِ عربی کے بغیر تحصیل علومِ دین، ایک بے معنی بات ہے

مجھے کہنے دیجیے کہ عربی زبان کو سمجھے بغیر تحصیلِ علوم دین کا مظاہرہ ایک ڈرامہ یا اضاعت وقت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ کیا افسوس کا مقام نہیں ہے کہ طلبہ آٹھ-دس سال کا قیمتی عرصۂ عمر جو کسی بھی علم و فن یا ہنر و پیشہ کے سیکھنے کا بہترین وقت ہوتا ہے، یعنی سنِ شعور سے ۲۵ سال تک

(صفحہ ۲۷ کا بقیہ حاشیہ)

ہائے مختفی سے پہلے والے حرف پر عموماً زبر ہوتا ہے۔ جب ایسا لفظ مُحَرَّف ہوتا ہے (یعنی جب اس کے بعد حرفِ جار آتا ہے یا اس کی جمع بنائی جاتی ہے یا دیگر صورتیں پیدا ہوتی ہیں) تو ہائے مختفی "ے" سے بدل جاتی ہے اور اس سے پہلے حرف کا زبر زیر سے بدل جاتا ہے۔ جیسے: پردہ، جلوہ، بندہ، عرصہ، مے خانہ، افسانہ، پیمانہ، غصہ، مدرسہ، پٹنہ، کلکتہ، غنچہ ــــــ کو پردے، جلوے، بندے، عرصے، مے خانے، افسانے، پیمانے، غصے، مدرسے، پٹنے، کلکتے، غنچے لکھا جائے گا۔

غنچے! تری زندگی پہ دل ہلتا ہے   بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے

کا عرصہ؛ بلا ضرورت ضائع کر دیتے ہیں اور انھیں اپنے وقتِ گراں مایہ کے ضیاع کا ذرا بھی احساس اور افسوس نہیں ہوتا۔ ہاں انھیں افسوس تب ہوتا ہے جب وقت ضائع کر کے یہاں سے فارغ ہو کر اپنا سامان لیے(۱) مدرسے کے گیٹ سے نکل رکشے پر بیٹھ اسٹیشن کی راہ لے، اپنے گھر جانے کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ اس وقت سود و زیاں کا اس لیے جائزہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں کہ خواب دیکھتے رہنے کی منزل ختم ہو چکی ہوتی ہے اور عملی زندگی ان کے نہ چاہنے کے باوجود، ان کی منتظر ہوتی ہے؛ چناں چہ انھوں نے کیا کھویا اور کیا پایا کی واقعی مقدار ان کے سامنے آموجود ہوتی ہے اور انھیں خون کے آنسوں رونے پر مجبور کر دیتی ہے؛ لیکن جو خوش قسمت طلبہ (جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے) اپنے وقت اور خدائے حکیم کی دی ہوئی فرصتِ عمر کو صحیح موقع اور مصرف میں لگاتے اور ایک ایک منٹ سے فائدہ اٹھاتے رہے ہوتے ہیں، اُنھیں کوئی افسوس دامن گیر نہیں ہوتا؛ کہ ان کا سرمایۂ علم و کمال اور اُثاثۂ سعادت ان کے لیے بہترین مستقبل کے اشاریے کی صورت میں

---

(۱) لیے، دیے، کیے، جیے، سیے، چاہیے، دیجیے، لیجیے، کیجیے، اٹھیے، بولیے، بیٹھیے، کھولیے، تولیے: "ی" سے لکھے جائیں گے، لیکن گئے، گئی، نئے وغیرہ کو ہمزے سے لکھا جائے گا۔

اس سلسلے میں قاعدہ یہ ہے کہ "ے" سے پہلے والا حرف، مکسور ہے تو ہمزہ نہیں آئے گا "ی" لکھی جائے گی، تو گویا دو یا جمع ہو جائیں گی "ی" (معروف) "ے" (مجہول) جیسا کہ (ل + ی + ے = لیے) میں آپ نے دیکھا۔

اور اگر "ے" سے پہلے کے حرف پر زبر ہو تو وہاں ہمزہ آئے گا جیسا کہ "گئے" (گ + ء + ے = گئے) میں آپ نے مشاہدہ کیا۔

لیکن فرمائیے، جائیے، آئیے، کھائیے، سوئیے کو "ے" سے پہلے ہمزہ لگا کر لکھیں گے، کیوں کہ یہ اصلاً (فرما + اِیے = فرمائیے) ہے۔

ان کے سامنے موجود اور ان کے لیے محسوس ہوتے ہیں۔

مقصد کا صحیح شعور ہی شہیدِ جستجو بناتا ہے

برادرانِ عزیز! میرا یہ احساس ہے کہ طلبۂ مدراس عربیہ کی بڑی تعداد کی یہ افسوسناک صورتِ حال، درحقیقت ان کی بے مقصدیت کا حتمی نتیجہ ہے۔ طلبہ کو ان کے والدین کسی مدرسے میں ڈال دیتے ہیں اور وہ ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں منتقل ہوتے ہوئے دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مراد آباد اور مدرسہ مظاہر علوم ایسے مرکزی درس گاہ ہائے علومِ دین و شریعت تک آپہنچتے ہیں۔ اُنھیں ان کے والدین یا کسی نے یہ نہیں بتایا ہوتا ہے کہ تحصیلِ علمِ دین سے تمھاری غرض کیا ہے؟ افسوس ہے کہ مدرسوں کی آٹھ دس سالہ زندگی میں، مدارس کے ذمے داران بھی عموماً طلبہ کو باقاعدہ طور پر، اُن کے مقصد کا تصور اُن کے ذہن میں، اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بعض اساتذہ انفرادی طور پر درس گاہوں اور نجی مجلسوں میں مقصد کی عظمت پر روشنی ڈالتے رہتے ہیں؛ لیکن اس سے کما حقہ مقصد کی شناخت ان کے ذہن میں قائم نہیں ہو پاتی۔

مقصد کا صحیح شعور ہی انسان کو انتھک کوشش پر آمادہ کرتا ہے اور انسان بہت سی لذیذ و عزیز باتوں کی قربانی دے کر منزل تک پہنچنے کی ٹھان لیتا ہے۔ مقصد ناشناسی، یا مقصد کا ابہام اور اس کا ذہنی الجھاؤ یا اس کی واقعی تعیین سے لاپرواہی، ایک انسان کو شہیدِ جستجو بننے نہیں دیتا۔

اگر آپ یقین کے ساتھ یہ جان لیں کہ آپ کا مقصدِ اولیں تحصیل

علمِ دین سے، یہ ہے کہ آپ اسلام کے داعی وسپاہی اور سرکارِ دوعالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامِ جاوداں کے وفادار وجاں نثار خادم بنیں، تو یقیناً آپ کا طلبِ علم کے حوالے سے موجودہ رویہ یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ آپ وقت، فرصت اور حاصل شدہ مواقع سے انتہائی حد تک فائدہ اٹھانے کی کوشش سے باز نہ آئیں گے۔ آپ کسی سبق اور محاضرے کو سمجھے بغیر کھانے پینے کے لیے، اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکیں گے۔ زیرِ درس مضامین ومواد کو ہر جتن کے بعد اپنے ذہن میں جمائے بغیر، دنیا کی لذتیں آپ کو تلخ معلوم ہوں گی۔ اور آپ یہ ہرگز نہ کر سکیں گے کہ۔

صبح ہوتی ہے ، شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی ، تمام ہوتی ہے

طلبۂ مدارس عربیہ کی قابلِ اصلاح صورتِ حال

عزیز طلبہ! اگر آپ کو مقصد کا صحیح اِحساس ہو جائے، تو آپ اپنے موجودہ رویے سے (جس سے مجھ جیسے ایک ظاہر بیں اور کوتاہ نظر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے گویا طلبِ علم کو ایک کھلونا، طالبِ علمانہ زندگی کو ایک تماشہ اور اِس زندگی کے قیمتی تر لمحات کو بے معنی سمجھ رکھا ہے) یقیناً باز آجائیں گے اور اپنے باکمال استاذ، ہونہار ساتھی اور ذی استعداد طالبِ علم سے درس کے اوقات کے بعد ہی سہی اور ہر طرح کے تملق، خوشامد اور دست بستگی کے ساتھ ہی سہی؛ آپ روزانہ کے اسباق کو ہضم کیے بغیر، ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے نظر آئیں گے۔

عزیز طلبہ ! آپ میری تلخ کلامی کو معاف فرمائیں کہ میرے اِحساسات نے مجھے زخمی کر رکھا ہے۔ میں چوں کہ ہندوپاک کے سب سے بڑے اور پرانے مدرسے اور ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی سب سے بڑی علامت اور جلی عنوان کی حیثیت رکھنے والے دار العلوم کا مدرس ہوں؛ اِس لیے میرے سوچنے اور سمجھنے کا انداز دیگر مدرسوں کے مدرسین سے قدرتی طور پر مختلف ہے اور رہنا چاہیے۔ یہ دین کے داعیوں، ملت کے سپاہیوں، شریعت کے رازدانوں اور اِس دیار میں اسلام کے پاسبانوں کا سب سے بڑا اور سب سے بابرکت کارخانہ ہے۔ اِس کارخانے کی سرگرمی اور بلا توقف مطلوبہ معیار کے افراد کی تیاری، اِس ملت کی زندگی کی علامت اور ہر خطرے سے اس کے محفوظ رہنے کی ضمانت ہے۔ یہاں کے طلبہ کی ذمے داری دیگر اِداروں کے طلبہ سے قدرتی طور پر بڑھی ہوئی ہے؛ اِس لیے دیگر مدرسوں کے طلبہ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے ہیں اِس سے قطع نظر مجھے یہ اِحساس ستا تا رہا ہے کہ ہمارے طلبہ اپنی معززانہ ذمے داری کے معیار سے بہت گر گئے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ عزیز طلبہ میں عہدِ ماضی کا سا ذوق و شوق نہیں رہا، غالباً اُن کی ایک بڑی تعداد مطالعے کے بغیر درس گاہ میں آجاتی ہے اور ہر چند کہ یہاں کے طلبہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود تا ہنوز امتیازی شان رکھتے ہیں؛ لیکن ضرورت تابناک ماضی کی طرف مکمل بازگشت ہے۔ بہر صورت جب یہاں کے طلبہ کا یہ حال ہے، تو دیگر مدرسوں کے طلبہ کا کیا حال ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

آپ ہی بتایئے کہ اس طرح کی جامد، لایعنی اور بے معنی زندگی،

آپ حضرات کے لیے زیبا ہے؟ ہم اگر اس علم و فن کو بھی نہ سمجھیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کریں؛ جس کے پڑھنے، سمجھنے، سمجھانے بتانے، اور اس کی روشنی میں اپنی، اپنے لوگوں کی، پھر خلقِ خدا کی زندگی کی چول بٹھانے کے مقصد سے ہی، ہم اسلامی تعلیم کے ان قلعوں کا رخ کرتے ہیں؛ تو آپ ہی بتائیے کہ کیا اس سے دین کی خدمت اور اسلام کا کلمہ بلند کرنے کا کوئی عمل اس ترقی یافتہ دنیا میں انجام دیا جاسکتا ہے، جس میں لوگ چاند پر بسنے، ستاروں پر کمند ڈالنے، اور فضا میں آبادی بسانے کی سوچ رہے ہیں؛ جس میں دنیا کے آخری سرے کی تازہ ترین معلومات آن کی آن میں معلوم کی جاسکتی ہے، جس میں گھر بیٹھے بٹھائے کمپیوٹر کی ترقی یافتہ شکل کے ذریعے کسی بھی علم و فن کی کوئی بھی جان کاری حاصل کی جاسکتی ہے؛ جس میں تمام سرگرمیاں برقِ خاطف کی طرح انجام پذیر ہوتی ہیں، جس میں کامیابی و ناکامی کے طریقے، سازش کے عناوین اور دشمنی کے اسالیب بدل گئے ہیں اور ہر چیز کا پیمانہ و میزان ازسرِ نو بنایا گیا ہے۔ یہ دور اسلام کے خدام سے اس بات کا متقاضی ہے کہ اصولِ اسلام اور ثوابتِ دین پر باقی رہتے ہوے وہ زمانے سے ہم آہنگ ہوں، اس کی دوڑ میں شریک ہوں، ہواؤں کا رخ سمجھیں، حالات کے اشاروں کو باور کریں، ترقی کے قافلوں کو نہ صرف چھونے پر اکتفا کریں، بلکہ انھیں زیادہ ترقی کے ساتھ اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کردیں۔

ضمیر لالہ میں روشن، چراغِ آرزو کردے
چمن کے ذرّے ذرّے کو، شہیدِ جستجو کردے

اِخلاص وللّٰہیت کے پُتلے

ابھی کل کی تو بات ہے، آپ کے ماضی قریب کے اکابر سیدنا الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، عالمِ ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، عالمِ باعمل و مجاہد جلیل مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی کفایت اللہ، مولانا قاری محمد طیبؒ، مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے کس طرح اپنی طالب علمی کے اوقات سوچ سمجھ کر صرف کیے، کس طرح وہ شمعِ علم وہنر پر نچھاور ہوئے، کس طرح اُنھوں نے شب وروز ایک کیے؟ چنان چہ علم وعمل کے آفتاب وماہتاب بن کر نکلے۔ دین ودنیا کی کون سے بڑائی جس نے اُن کے قدم نہیں چومے اور خدمتِ دین کا کون سا گوشہ ہے جس میں ان کے اخلاص وللّٰہیت وربانیت کی بادِ بہاری نہ چلی ہو؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اُنھوں نے دین وکتاب وسنت کی یہ سعادت مندانہ خدمت آپ ہی کی طرح کی طالب علمانہ زندگی گزار کر کی تھی؟ ہرگز نہیں۔ انھوں نے خدمتِ دین اور تبلیغ اسلام کی عظیم ذمہ داری کو نباہنے کے مقصد کو سامنے رکھ کر طلبِ علم میں وہ محنت کی جو اس مقصد کے لیے مطلوب تھی؛ پھر خدا کی توفیق سے انھوں نے جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے؛ اسی لیے خدا کے بندوں کی جس محبت سے وہ بہرہ یاب ہوئے اور جس طرح لوگوں نے ان کے لیے آنکھیں بچھائیں وہ کون نہیں جانتا؟

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

عربی زبان کے حصول کی دوسری سطح

عربی زبان کے حصول کی دوسری سطح کی بات کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

عزیز طلبہ ! اس سلسلے میں بھی بڑی کوتاہی ہو رہی ہے جو اِس زمانے میں نہیں ہونی چاہیے۔ ہونی تو کبھی نہیں چاہیے تھی ؛ لیکن ماضی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جا چکی، مسئلہ مستقبل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حال کا ہے۔ اس وقت تمام باطل تحریکوں اور نظریات نے، نیز مسلمانوں کی طرف منسوب بعض خطرناک تصورات کی حامل جماعتوں اور فرقوں نے ؛ زبان پر قبضہ جما رکھا ہے۔ یہ فرقے اسلام پر اور مسلمانوں کی راہِ اعتدال پر قائم جماعت پر بہت اچھی زبان میں، جو مارکیٹ میں چلتی ہے، جس میں زندگی ہے، حلاوت و صلابت ہے، جو قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے ؛ طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں اور مسلمہ قواعد و اصول اور اکابرِ ملت کی عظمت کی تمام عمارتوں کو مسمار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہماری طرف سے اردو یا عربی وغیرہ میں ان کے اعتراضات کے جو جوابات دیے جاتے ہیں وہ اپنی معقولیت واستدلالیت کے باوجود کماحقہٗ اثر نہیں دکھاپاتے، کہ ان کے اعتراض کی زبان کے معیار کو ہمارے جوابات نہیں چھو پاتے۔

زبان اِس وقت بطورِ خاص ایک ترقی یافتہ ہتھیار بن گئی ہے۔ اس وقت کی تحریکیں، دیگر وسائل کے ساتھ بڑے بڑے معرکے، زبان، لٹریچر اور ذرائع ابلاغ وغیرہ کے ذریعے ہی سر کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں تاہنوز کوتاہی برتی جارہی ہے۔ اور اس سلسے میں جس احساس

اور احساس کے بعد جس فکر و عمل کی ضرورت ہے، وہ یکسر مفقود ہے۔

مقامِ خوشی ہے کہ اِس سلسلے میں ہمارے علمی و روحانی مرکز دار العلوم دیو بند میں استاذ الاساتذہ مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہل کی اور عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھانے کی طرح ڈالی، بلکہ کہنا چاہیے کہ انھوں نے اس سلسلے میں صور پھونکا، جس سے ہماری سوتی ہوئی جماعت جاگ اٹھی۔ چوں کہ برِ صغیر کے اکثر اسلامی مدرسے اسی بابرکت سر چشمے سے نکلے ہیں؛ اس لیے ان کی یہ آواز ہر جگہ سنی گئی۔ ان کے سیکڑوں ہونہار شاگردوں نے دار العلوم میں ان سے پڑھ کر اور دیگر مدرسوں میں پہنچ کر "مکبر" کا کام کیا۔ ان کی طرز پر ہر جگہ عربی تحریر و تقریر کی فضا عام کرنے میں سرگرم حصہ لے کر اپنے رب کی جزا اور علمائے دین کے شکر و سپاس کے مستحق ہوے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی یہ مبارک بزم، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خدائے پاک کی آخری کتاب کی زبان کے نام سے منعقد ہوئی ہے اور آپ کی النادی الادبی اور آپ کا درجۂ تکمیلِ ادبِ عربی، اسی مردِ ہوشیار کی صدائے باز گشت ہے۔ خدا اُنھیں بہت نوازے اور ہم لوگوں کو ان کے فکر و عمل پر کاربند ہونے کی توفیق بخشے، آمین۔

حصولِ زبان عربی کے لیے چند ناگزیر باتیں

برادرانِ عزیز! اس خصوص میں بھی میرا یہ احساس ہے کہ ہم لوگ ایک تو تحصیلِ زبانِ عربی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں، تو اس کی تحصیل کے موٹے موٹے اصولوں کو بھی

نہیں برتتے ؛اس لیے خاطر خواہ فائدہ سامنے نہیں آتا۔

دیکھیے زبان کے حصول میں کچھ چیزیں اتنی اہم ہیں کہ اگر اُن میں سے کسی ایک کے حوالے سے بھی غفلت برتی جائے تو گویا اس زبان کے حصول کی کوشش ناقص اور بڑی حد تک بے نتیجہ رہ جاتی ہے :

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ زبان کو بولنے، اپنی عام گفتگو میں برتنے، نیز تقریر کرنے اور اپنے مافی الضمیر کو اس میں زبانی ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ یعنی یہ کہ زبان کو "نطقاً" حاصل کرنا، سیکھنا اور برتنا ضروری ہے۔ کسی زبان کا "نطقاً" حصول، خاصا آسان ہے : ہمیشہ، ہر وقت اور ہر جگہ اپنی گفتگو اسی زبان میں کی جائے، تو بولنا آجاتا ہے۔ کم بولا جائے اور اِس سلسلے میں شرم محسوس کی جائے کہ ساتھی ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے، تو پھر اس کو "نطقاً" حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

(۲) دوسری بات یہ کہ زبان کو "کتابتاً" بھی حاصل کیا جائے ؛ بلکہ "کتابتاً" حاصل کرنا "نطقاً" اور "خطابتاً" سیکھنے سے زیادہ ضروری ہے ؛اس لیے کہ تقریر اور گفتگو کا فائدہ عموماً وقتی ہوا کرتا ہے، جب کہ تحریر کا فائدہ دیرپا اور دور رس ہوا کرتا ہے۔ گفتگو کرنے والے کی گفتگو اور مقرر کی تقریر، خواہ وہ مقرر کتنا ہی لسّان اور قادر الکلام ہو ؛اس کے اِس دنیا سے چلے جانے کے بعد، بلکہ بعض دفعہ اس کے حینِ حیات ہی نسیاً منسیاً ہو جاتی ہے۔ لیکن اہلِ قلم کا مضمون اور مؤلف کی تصنیفات بعض دفعہ صدیوں، بلکہ ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" (انسانوں کے لیے مفید) کے خدائی معیار پر وہ جس درجہ اترتی ہیں اسی

درجہ "یَمْکُثُ فی الارض" یعنی پائدار زندگی کی حامل ہوتی ہیں۔ ہم جو کتابیں درس میں پڑھتے ہیں یا مطالعہ کرتے ہیں، ان کے لکھنے والے صدیوں پہلے اس جہانِ فانی سے جاچکے؛ لیکن ان کی نگارشات جاوداں ہے اور ہم ان سے فائدہ اٹھاکر ان کے لیے قلب وزبان سے دعا کرتے رہنے کو سعادتِ دارین کا بہترین ذریعہ گردانتے ہیں۔

بہرحال تقریر و تحریر دونوں کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے، کسی ایک کا بھی نقص صحیح نہیں؛ لیکن تحریر پر توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں یہ بات بھی کہنی ضروری ہے کہ زبان کو "نطقاً" حاصل کرنا، صرف آسان ہی نہیں، بلکہ قلیل المدت کام بھی ہے؛ لیکن "کتابتاً" حاصل کرنا قدرے محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند ماہ کی محنت سے ہم اچھا بولنے لگتے ہیں۔ بلکہ نطق کے لیے علم اور قواعد کی بھی ضرورت نہیں، صرف ونحو کے بغیر بھی لوگ کسی زبان کو، بلکہ عربی زبان کو بھی، جو ہم عجمیوں کے لیے ذرا مشکل بھی ہے؛ بول لیتے ہیں، خصوصاً اگر ماحول مل جائے یا اہلِ زبان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے (۱) کا موقع مل جائے۔ ساری دنیا کے عجم آج کل تلاشِ معاش میں عرب ممالک کا رخ کررہے ہیں اور بالکل جاہل لوگوں کو ہم

---

(۱) یہاں یہ لفظ اسی طرح "زا" سے ہی لکھا اور بولا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمارے مدارس کے ماحول میں خصوصاً اور اردو لکھنے والوں کے حلقے میں عموماً بڑی بے پرواہی برتی جاتی ہے اور "ذ" اور "ز" کا فرق اس طرح کے مواقع پر بالکل ہی نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

فارسی کے پانچ مصادر ہیں: گذشتن، گذاشتن، گذاردن، پذیرفتن، گزاردن۔ شروع کے چاروں مصادر میں "ذ" ہے اور آخری مصدر میں "ز" ہے۔ اول الذکر چاروں سے جو الفاظ بنیں گے ان میں "ذ" ہی ہوگا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیکھتے ہیں کہ وہاں چند سال گزارنے کے بعد غلط سلط سہی، رواں دواں عربی بولنے لگتے ہیں اور وہاں کی مقامی زبان تو، پڑھے لکھے لوگوں سے

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ)

گذشتن، گذاشتن، گذاردن سے مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ بنتے ہیں:

گذشتہ، یارانِ گذشتہ، زمانۂ گذشتہ، سرگذشت، گذرگاہ، درگذر، راہ گذر، عمر گذاراں، گذار، گذراں وغیرہ۔

چلنے، چھوڑنے، اور پار کر دینے کے معنی میں تمام الفاظ گذاردن، گذاشتن اور گذشتن سے بنیں گے اور "ذ" سے لکھے جائیں گے۔

بوئے گل، رنگِ چمن اور یہ عمر گذراں:
سب ٹھہر جائیں گے، کوئی اسے روکے تو سہی

بیٹھے ہیں دل کو بیچنے والے ہزارہا
گزری ہے اس کی راہ گذر پر لگی ہوئی

گزاردن "ز" والے کلمے سے جو الفاظ مشتق ہوں گے وہ "ز" ہی سے لکھے جائیں گے۔ اس کے معنی پیش کرنا، ادا کرنا، اور شرح کرنا کے ہیں، جیسے:

گزارش، نماز گزار، تہجد گزار، خدمت گزار، مال گزار، مال گزاری، شکر گزار، عبادت گزار، :

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار، یا اسے رو کر گزار دے

"پذیرفتن" سے جو الفاظ آئیں گے "ذ" سے لکھے جائیں گے:

پذیرائی، دل پذیر، خلل پذیر، اثر پذیر، پذیرفتہ وغیرہ

(دیکھیے "املا نامہ"، "صحتِ الفاظ"، اور "اردو کیسے لکھیں" وغیرہ)

بھی اچھی بولنے لگتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کسی زبان کو محض بولنے کے دائرے میں سیکھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

جب کہ تحریر کے لیے ضروری ہے کہ قواعد و آدابِ زبان کی رعایت کی جائے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتوں کی ضرورت ہے، جو کثرتِ مشق اور مسلسل لکھتے رہنے، نیز اساتذۂ ادب و سخن کی نگارشات سے پیہم اور گہرائی کے ساتھ استفادہ کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں: ترتیب، تقدیم و تاخیر، بوقتِ ضرورت دراز نفسی و اختصار، سہولت، سلاست، شیرینی، ادائے پرکشش، ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ، موضوع کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب، جملوں کی خاص قسم کی نشست اور ایک ایسی طرزِ سخن کہ قاری، جب مضمون یا کتاب کو ہاتھ میں لے، تو اسے از اول تا آخر پڑھے بغیر چین نہ آئے، شرط یہ ہو کہ وہ اسے شروع کر دے پھر ختم کیے بغیر وہ دم نہ لے سکے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر عناصر تحریری کے بعد ہی کسی تحریر کو تحریر کہا جا سکتا ہے اور اِسی طرح کی تحریروں سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اِن عناصر سے خالی نگارشات کو صرف "معتقدین" یا متعلقہ افراد جنھیں ان کا پڑھنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ناگزیر ہوتا ہے؛ پڑھتے ہیں اور جن "قرائے مستحقین" کے پڑھنے کے لیے، بلکہ پڑھوانے کے لیے لکھی گئی ہوتی ہیں؛ وہ اُنھیں ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔

جملہ نگاری سے مضمون نگاری تک

یہاں لکھنے لکھانے کی بات آگئی ہے، تو یہ عرض کر دوں کہ پہلے

قدم پر چھوٹے چھوٹے جملے لکھنے کی مشق کرنی چاہیے۔ چھوٹے سے بڑے، کچھ زیادہ بڑے اور بہت بڑے کی طرف بڑھنا چاہیے۔ یہ فطری طریقہ ہے، آسان ہے، سود مند ہے اور حوصلہ افزا ہے۔ اس طرح مسافرِ ہمت راستے سے واپس چلے آنے کی کبھی نہیں سوچتا۔

جیسے: آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے کہ هٰذِهِ شَجَرَةٌ پھر کہیے: هذه شجرة كبيرةٌ، پھر کہیے: هذه شجرة كبيرة مُثْمِرَةٌ ← هذه شجرة كبيرة مثمرة مخضرة ← هذه شجرة كبيرة مثمرة مخضرةٌ، لونُها جميلٌ، أوراقُها مائلةٌ إلى الصفرةِ، ساقُها ضخمٌ، أغصانُها تترامى إلى بعيدٍ۔ اسی طرح آگے بڑھتے جائیے اور اس درخت کے متعلق جو کچھ کہنا ہے (اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے) وہ کہتے چلے جائیے۔

جملہ فعلیہ کو لیجیے، تو اولاً یہ کہیے کہ:

يذهب نبيلٌ إلى المدرسه. پھر اسے بڑھائیے اور کہیے کہ: يذهب نبيل إلى المدرسة بالدراجة ← يذهب نبيلٌ إلى المدرسة كلَّ يوم بالدراجة ← يذهب نبيلٌ إلى المدرسة كلَّ يوم في الصباح الباكر بالدراجة ← يذهب نبيلٌ إلى المدرسة – وهي تبعد عن بيته بثلاثة أميال – كلَّ يوم في الصباح الباكرِ بالدراجة، ويصل إلى المدرسة على الميعاد، ويدخل الفصلَ قبل جميع زملائه. وذلك كلّه يدل على مدى رغبته في الدراسة.

میرا مقصد یہ ہے کہ پہلے والے جملے کو، جو جملۂ اسمیہ ہے؛ پہلے

چھوٹی شکل میں لے کر اسی طرح کے بہت سے جملے لکھیے اور بولیے۔ مثلاً :

هذه شجرةٌ کی زمین میں کہیے : **تلك سبُّورة، هذه نَافِذَةٌ، ذلك كتابٌ، هذا قلمٌ، ذلك طالبٌ، هذا مدرسٌ، ذلك مُهَنْدِسٌ، هذه كُلِّيَّةٌ، تلك جَامِعَةٌ، هَذَا نَهْرٌ، ذلك بَحْرٌ، هذه زَيْنَبُ، تِلك نَبِيْلَةُ، هذه رُوْبِيَّةٌ، تلك حقيبةٌ، هذه مَحَطَّةٌ، ذلك مَوْقِفٌ.** (۱)

اب اس کو آپ تثنیے کی صورت میں ڈھالیے اور کہیے :

هاتان شجرتان، تانكَ سبّورتان، هاتان نافذتان، ذانك كتابان، هذان قلمان، ذانك طالبان، هذان مدرسان، ذانك مُهَنْدِسَان، هاتان كليتان، تانك جامعتان، هذان نهران، ذانك بحران، هاتان زينبُ و عائشةُ، تانك نبيلةُ و خالدةُ، هاتان روبيتان، تانك حقيبتان، هاتان محطّتان، ذانك موقفان. (۲)

پھر انھیں جملوں کو اسی چھوٹی شکل میں بصورتِ جمع اس طرح ادا کیجیے :

هذه أشجارٌ، تلك سبّوراتٌ، هذه نوافذُ، تلك كتبٌ، هؤلاء مُدَرِّسون، أُولٰئِكَ مهندسون، هذه كلياتٌ، تلك

---

(۱) **تلك سبُّوْرَةٌ** سے **ذلك مَوْقِفٌ** تک جملوں کا اردو ترجمہ یہ ہے : وہ تختۂ سیاہ ہے، یہ کھڑکی ہے، وہ کتاب ہے، یہ قلم ہے، وہ طالب علم ہے، یہ مدرس ہے، وہ انجینیر ہے، یہ کالج ہے، وہ یونیورسٹی ہے، یہ ندی ہے، وہ سمندر ہے، یہ زینب ہے، وہ نبیلہ ہے، یہ روپیہ ہے، وہ بیگ ہے، یہ اسٹیشن ہے، وہ اسٹینڈ ہے۔

(۲) یہ دو درخت ہیں، وہ دو تختہ ہائے سیاہ ہیں، یہ دو کھڑکیاں ہیں، وہ دو کتابیں ہیں، یہ دو قلم ہیں، وہ دو طالب علم ہیں، یہ دو مدرس ہیں، وہ دو انجینیر ہیں، یہ دو کالج ہیں، وہ دو یونیورسٹیاں ہیں، یہ دو ندیاں ہیں، وہ دو سمندر ہیں، یہ زینب اور عائشہ ہیں، وہ نبیلہ اور خالدہ ہیں، یہ دو روپے ہیں، وہ دو بیگ ہیں، یہ دو اسٹیشن ہیں، وہ دو (بس) اسٹینڈ ہیں۔

جامعاتٌ، هذه أنهارٌ، تلك بحورٌ، هؤلاء زينبُ و عائشةُ و حفصةُ، أُولٰئِكَ نبيلةُ و خالدةُ و جميلةُ، هذه روبياتٌ، تلك حقائبُ، هذه مَحطَّاتٌ، تلك مَوَاقِفُ. (۱)

اِسی طرح جملہ اسمیہ ہی میں یوں کہا جاسکتا ہے :

أنا راشدٌ، هو خالدٌ، أنتَ جميلٌ، أنتِ ساجدةٌ .

اب ایک مرتبہ پھر پیچھے کو لوٹیے۔ سب سے پہلا جملہ ہے تلك سَبُّوْرَةٌ (یہ تختۂ سیاہ ہے) اب اِس کو ہم مزید لمبا کرنا چاہیں تو ایک جملہ اس میں یوں لگا سکتے ہیں : هِيَ سَوْدَاءُ . اب پورا جملہ یوں ہو جائے گا : تلك سبّورةٌ هيَ سَوْدَاءُ، اب یوں کہہ سکتے ہیں : تلك سبورة، هي سوداء، هيَ مُربَّعَةٌ، هي كبيرةٌ، تقوم على أربع قوائمَ. مزید طویل کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں : يستخدمها المدرس لشرح الدرس، و لطرح الموادّ الصعبة على الطلاب، لولاها لواجهنا نحن الطلابَ صعوبةً كبيرةً في إساغَةِ الدّرسِ، و لوَجَدَ المدرسُ كذلك مشقةً في تسهيلِ الموادّ و تقريبها إلى أفهامِنا، و ترسيخِها في أذهانِنا؛ فالسبّورةُ كأنّها مُدَرِّسَةٌ، و مِنّتُها عَلَيْنَا

---

(۱) یہ درخت ہیں، وہ تختۂ ہائے سیاہ ہیں، یہ کھڑکیاں ہیں، وہ کتابیں ہیں، یہ قلم ہیں، وہ طلبہ ہیں، یہ مدرسین ہیں، وہ انجینیر ہیں، یہ کالج ہیں، وہ یونیورسیٹیاں ہیں، یہ ندیاں ہیں، وہ سمندر ہیں، یہ زینب، عائشہ اور حفصہ ہیں، وہ نبیلہ، خالدہ اور جمیلہ ہیں، یہ روپے ہیں، وہ بیگ ہیں، یہ اسٹیشن ہیں، وہ (بس) اسٹینڈ ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اِشارۂ بعید کے لیے، مذکر اور مؤنث دونوں صورتوں میں، جمع کا صیغہ أولالِكَ آتا ہے ؛ أولٰئِكَ إشارۂ متوسطہ کے لیے آتا ہے ؛ لیکن عام طور پر اِسی کو بعید کے لیے استعمال کرنے کا چلن ہے۔

كَبِيْرَةٌ، والمَدْرَسَةُ جديرةٌ بشكرنا جميعاً؛ حيث وَفَّرَتْ لنا مثلَ هذه الأداة المفيدةِ جداً .(۱)

اِسی طرح مثلاً: هذه نافذةٌ کوکچھ بڑا کیا جائے تو هذه نافذة كبيرةٌ کہا جاسکتا ہے۔ پھر هذه نافذة كبيرةٌ جميلة کہا جاسکتا ہے۔ پھر هذه نافذةٌ كبيرةٌ جميلةٌ تنفتح على حديقة البيت کہا جاسکتا ہے۔ پھر کچھ اور طویل کر کے یوں کہا جاسکتا ہے: هذه نافذة كبيرة جميلة تنفتح على حديقة البيت، و تُصَرِّفُ في البيت الهواءَ الطازجَ و النّسيمَ العليلَ، و توصل أشعة الشمسِ إلى داخل الحجرة في صباح الأيامِ الشاتيةِ، و توصل الرياحُ عن طريقها إلينا رائحةَ الأزهار الزكيةَ التي تكثرُ في حديقة البيت، و من خلالها نُطِلُّ على الخضرة الرائعةِ الساحرةِ في الحديقةِ، فالنافذةُ ذاتُ منافعَ عديدةٍ، و مسراتٍ كثيرةٍ، لولاها لتضايقنا بالحجرةِ و لسئمنا داخلَها. (۲)

---

(۱) وہ تختۂ سیاہ ہے، وہ چوکور ہے، وہ بڑا ہے، اس کے چار پائے ہیں، درس کی وضاحت اور طلبہ کے سامنے پیچیدہ مضامین کو پیش کرنے کے لیے، مدرس اس کو استعمال کرتا ہے۔ اگر تختۂ سیاہ نہ ہوتا تو ہم طلبہ کو درس کے ہضم کرنے میں دشواری ہوتی۔ مدرس کو بھی مضامین کو آسان بنانے، ہمارے ذہنوں سے قریب کرنے اور ہمارے ذہنوں میں انھیں اتارنے میں پریشانی ہوتی۔ گویا تختۂ سیاہ ایک مدرس ہے، اس کا ہمارے اوپر بڑا احسان ہے، ہمارا اسکول / مدرسہ ہم سبھوں کے شکریے کا مستحق ہے کہ اس نے اس مفید ترین آلۂ تعلیم کا ہمارے لیے انتظام کیا ہے۔

(۲) یہ کھڑکی ہے، یہ بڑی کھڑکی ہے، یہ بڑی اور خوب صورت کھڑکی ہے، یہ بڑی اور خوب صورت کھڑکی ہے۔ یہ گھر کے باغ کی اُور کھلتی ہے، تازہ ہوا اور بھیگی بھیگی بادِ نسیم گھر میں لایا کرتی ہے، جاڑے کے دنوں میں صبح کے وقت دھوپ پہونچاتی ہے، اِسی کے ذریعے اُن پھولوں کی پاکیزہ خوشبو کو ہوائیں گھر میں لاتی ہیں، جن کی باغ میں بہتات ہے، اور اسی کے ذریعے ہم باغ کے سحر انگیز اور خوب صورت سبزے کو دیکھ پاتے ہیں؛ لہٰذا اس کھڑکی کے متعدد فائدے ہیں، یہ بہت سی خوشیوں کا ذریعہ ہے۔ اگر کھڑکی نہ ہوتی تو ہم کمرے سے تنگ آجاتے اور اس کے اندر ہمیں اُکتاہٹ محسوس ہوتی۔

اِسی طرح اِس سلسلۂ کلام کو مزید دراز کیا جاسکتا ہے اور ایک ذرے کو صحرا اور رائی کو پہاڑ بنایا جاسکتا ہے۔

اِسی طرح دیگر جملوں کو دراز، دراز تر، پھر ایک پیراگراف اور پھر ایک مضمون میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

أَنَا رَاشِدٌ والی مثال میں بھی اس طرح اضافہ کیا جاسکتا ہے:

أَنَا رَاشِدٌ، أنا هنديٌ، أنا في العشرين مِنْ عمري، أَنَا مُتَعَلِّمٌ في دار العلوم ديوبند منذ ستِّ سنوات، أنا أفوز دائماً بالعلاماتِ الممتازة. (۱)

اسی طرح جتنا چاہیے کہتے چلے جایئے۔

دوسرے جملے کو لیجیے، تو کہیے:

هُوَ خَالِدٌ، هو باكستانيٌّ، هُوَ فِي الثَّلاثِيْنَ مِنْ عُمْرِهِ، هُوَ مُهَنْدِسٌ، هُوَ يَعْمَلُ في شَرِكَةٍ، هو مُوَظَّفٌ قديم فيها، هو نال الترقية حديثاً، فصار مديراً، هو جميلُ الخلق، مُجْتَهِدٌ في عمله، هُوَ مُحْبُوْبٌ في العُمَّال، و محبوبٌ لدى صَاحِبِ الشركةِ، أولادُه كذلك يُحِبُّوْنَه كَثِيْرًا. (۲)

اِسی طرح جتنا چاہیے کہتے چلے جایئے۔

---

(۱) میں راشد ہوں، میں ہندوستانی ہوں، میں بیس برس کا ہوں، میں دارالعلوم دیوبند میں چھ سال سے زیر تعلیم ہوں، میں ہمیشہ نمایاں نمبرات سے کامیاب ہوتا ہوں۔

(۲) وہ خالد ہے، وہ پاکستانی ہے، اس کی عمر تیس برس ہے، وہ انجینیر ہے، ایک کمپنی میں کام کرتا ہے، وہاں وہ پرانا ملازم ہے، حال ہی میں اسے ترقی ملی ہے، چناں چہ اب وہ ڈائرکٹر ہے، وہ شیریں اخلاق ہے، اپنے کام میں محنتی ہے، مزدوروں میں محبوب ہے، کمپنی کا مالک بھی اس کو چاہتا ہے، اُس کے بچے بھی اُس سے محبت کرتے ہیں۔

لیکن شروع شروع میں صرف هو خالدٌ، أنَا محمودٌ، أنتِ سعادُ، هُمَا ساجدةٌ و خالدةٌ، نحن راشدٌ، و نبيلٌ و رشيدٌ وغیرہ کے طرز کے جملے ہی کی خوب مشق کرنی چاہیے، پھر حسبِ ضرورت اس میں اضافہ کرتے چلے جانا چاہیے۔ ہر اضافے کے ساتھ بہت سارے جملے بنانے کی کوشش کرنی چاہیے ؛ تاکہ جملوں کی ترکیب و ترتیب اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

اب آپ ایک مرتبہ پھر "يَذْهَبُ نَبِيلٌ" سے شروع ہونے والے جملۂ فعلیہ کی طرف لوٹیے : اِس میں آپ "يَذْهَبُ" کی جگہ پر "تَذْهَبُ" رکھ کر جملہ کو بڑا، اُس سے بڑا اور پھر بڑے سے بڑا بناتے چلے جایئے ؛ آپ کہیے :

تذهب أنتَ إلى المَدْرَسَةِ، تذهب أنتَ إلى المدرسةِ بالدَرَّاجَةِ، تذهبُ أنتَ إلى المدرسة كُلَّ يَوْمٍ بالدراجة، تذهبُ أنت إلى المدرسة كل يوم بالدرَّاجةِ في الصَّبَاحِ الباكر. (۱)

اِسی طرح آخر تک کہتے چلے جایئے۔

اِسی طرح "يَذْهَبُ" کی جگہ پر "تذهبين" رکھ کر سارے جملوں کو حسبِ ضرورت بدلتے چلے جایئے۔

پھر "تذهبان" رکھ دیجیے، "أذهَبُ" ، "نَذْهَبُ" رکھ دیجیے اور ضمائر میں جس تبدیلی کی ضرورت ہے کرتے چلے جایئے۔

نیز "إلى المدرسةِ" کی جگہ پر "إلى المَحَطَّة" ڈال سکتے ہیں، اور

---

(۱) تم مدرسے جاتے ہو، تم مدرسے سائیکل سے جاتے ہو، تم روزانہ سائیکل سے مدرسے جاتے ہو، تم روزانہ صبح سویرے سائیکل سے مدرسے جاتے ہو۔

اس طرح کہہ سکتے ہیں : أنَا أذهَبُ إلى المَحَطَّةِ ← أنَا أذهَبُ إلى المَحَطَّةِ كُلَّ يوْمٍ ← أنَا أذهَبُ إلى المَحَطَّةِ كُلَّ يوْم بسيَّارَتي، أنا مُوَظَّفٌ فيها، أعْمَلُ بائِعًا لِلتَّذاكِرِ، و أنالُ مُرَتَّبًا كبيْرًا، والمَحَطَّةُ بعيدةٌ عن بَيْتِي بَسبعةِ كلو مترات تقريباً، و المَحَطَّةُ جميلة، تحيطُ بها حُقُولٌ خَضْرَاءُ و بجانبها مَصْنَعٌ لإِنْتَاجِ السُّكَّرِ كبيرٌ. (١)

اِسی طرح ہلکے پھلکے جملوں کا اِضافہ کرتے اور خیال کو وسعت اور جملوں کو طول دیتے چلے جایئے۔

پہلی منزل

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ عرصے سے، تجربے کی بنیاد پر اس بات کا قائل اور داعی ہو گیا ہوں کہ شروع شروع میں صرف و نحو کی اصطلاحات اور ان کی تعلیم کا بار طلبہ پر نہ ڈالا جائے، بلکہ زبان سکھانے والی ہلکی پھلکی کتابیں، صرف اس لیے پڑھائی جائیں کہ طلبہ کے پاس الفاظ اور تعبیرات کا ایک ذخیرہ جمع ہو جائے۔

دوسری منزل

اس کے بعد آگے کی منزل میں اُنھیں ہر پیراگراف میں یا ہر صفحے

(۱) میں اسٹیشن جاتا ہوں، میں روزانہ اسٹیشن جاتا ہوں، میں روزانہ اپنی گاڑی سے اسٹیشن جاتا ہوں، میں وہاں ملازم ہوں، میں بکنگ کلرک ہوں، میری بڑی تنخواہ ہے، اسٹیشن میرے گھر سے تقریباً سات کلو میٹر دور ہے، اسٹیشن خوب صورت ہے، اس کے گرد ہرے بھرے کھیت ہیں، اور اس کے بغل ہی میں ایک بڑی چینی مل ہے۔

نیں صرف دو ایک جگہ بتادیا جائے کہ یہ (مثلاً) فلاں چیز ہے، اس کے بعد جب بھی کوئی لفظ آئے گا تو اس کو رفع (پیش) ہوا کرے گا۔ مثلاً:

کان اللهُ علیماً میں بتادیا جائے کہ اللہ کو پیش ہے؛ کیوں کہ "کان" کے بعد ہے، کان کے بعد جو لفظ آتا ہے اس کو ہمیشہ پیش آتا ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی بتایا جائے، اس سے زیادہ ہر گز کچھ نہ کہا جائے۔

دوسرے دن پھر یہ بتادیا جائے کہ "کان" کے بعد جو دوسرا لفظ ہوتا ہے اس کو ہمیشہ نصب (زبر) آیا کرتا ہے دیکھو "علیماً" کو زبر آرہا ہے۔

لیکن بار بار قاعدے نہ بتائے جائیں؛ بس ایک روز صرف ایک قاعدہ یا زیادہ سے زیادہ دو ہی قاعدے بتائے جائیں۔

بہر صورت جب کان کے بعد اللهُ - علیماً کی پوزیشن کو وہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیں، تو انھیں مفردات لکھوا دیے جائیں اور کانَ کے بعد دو لفظ ڈال کر بولنے اور لکھنے کے لیے مکلّف کیا جائے۔

مثلاً: نبیل = کبیر ، المدرسة = کبیرة ، سعاد = جمیلة القلم = ثمین ، المطار = بعید ، المحطّة = قریبة.

اس طرح روز روز ایک ایک قاعدہ بتانے اور مشق کرانے سے طالبِ علم کو بولنے اور لکھنے کی مشق ہو جائے گی اور جملوں کا جوڑ توڑ اسے معلوم ہو جائے گا۔

تیسری منزل

اِس سے آگے کے مرحلے میں نحو کی باقاعدہ تعلیم اور ریڈینگ

بک میں اس کی عملی : تحریری وزبانی مشق ہونی چاہیے۔ جملہ اسمیہ و جملہ فعلیہ اور ان دونوں کی اقسام، مبتدا و خبر، کان واخواتہا، إنّ واخواتہا، لائے نفیِ جنس، مفاعیل خمسہ، حال، استثنا، افعالِ ماضی و مضارع کی تمام اقسام، سین و سوف، مضاف مضاف الیہ، صفت موصوف، شرط و جزاء اور جملہ جزائیہ پر کب "فا" داخل ہوگی (۱) اور کب نہیں ہوگی (کیوں کہ طلبہ بلکہ فضلا اس سلسلے میں بڑی غلطی کرتے ہیں) افعالِ مقاربہ، فعل تعجب، فعلِ مدح وذم، نداء، استغاثہ و تعجب، اسم فعل وغیرہ کی مشق، تحریراً اور کلاماً دونوں طرح خوب ہو جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں بڑی توجہ، لگن اور ترغیب و تحریص کی ضرورت ہے تاکہ بنیاد مضبوط ہو جائے اور آئندہ کی علمی و لسانی عمارت کسی کجی کا شکار نہ ہو۔

قواعد کے ساتھ جملوں کی مشق نہایت ضروری ہے۔ مضمون نگاری، خیال نویسی اور کسی موضوع پر صفحہ دو صفحہ یا کئی صفحات کی مقالہ نویسی کی منزل میں قدم رکھنے سے پہلے، جملوں کی تمام اقسام، ان کے مابین رشتوں، ان کے لوازمات و تقاضوں، ان کی "نازک مزاجی" و حساسیت وغیرہ کو اچھی طرح جان لینا چاہیے۔ ان باتوں کو جانے بغیر آگے کی منزل کی طرف پھلانگنے سے قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کی ایک ادنی سی مثال دیتا ہوں : اگر آپ کو یہ کہنا ہو کہ "حضرات! میں اِس وقت یہ گزارش کرنی چاہتا ہوں کہ آپ لوگ آپس میں اتحاد پیدا کیجیے" اِس اردو کے جملے کو ایک مرتبہ اور پڑھ جایئے، اس میں

---

(۱) حرف "فا" اردو میں مؤنث ہے، اِسی طرح حروف تہجی کے مندرجہ ذیل حروف بھی: ب، پ، ت، ٹ، ث، چ، ح، خ، د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، ط، ظ، ع، غ، ہ، ھ، ی، ے۔ تین حروف: ج، م، ہمزہ مختلف فیہ ہیں۔

"یہ گزارش" میں جو "یہ" ہے اس کے لیے عربی میں "هذا" نہیں آئے گا بلکہ "أنَّ" یا "أنْ" کے بعد جو جملہ استعمال ہوگا، اسی سے یہ معنی ادا ہو جائے گا۔ بہرصورت اردو کے اس پورے جملے کو عربی میں یوں ادا کیا جائے گا:

"أيها السادة ! أودُّ أن ألتمس منكم بهذه المناسبة أن اتّحدوا"

لیکن اکثر طلبہ جو جملوں کی مزاج آشنائی اور ان کے رشتوں کی شناسائی کی منزل طے کیے بغیر عربی سیکھنے کے لیے "تخصص" کی منزل کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں وہ "أن ألتَمِسَ" سے پہلے "یہ" کے معنی کی ادائیگی کے لیے "هذا" لگاتے ہیں؛ جو بالکل ہی غلط ہے۔

اسی طرح اِسی منزل میں چوں کہ، باوجودے کہ، ساتھ ہی ساتھ، ہم رشتہ، اگرچہ کہ = ہر چند کہ، خواہ، خواہی نخواہی وغیرہ کی عربی بھی جان لینی چاہیے کہ ان کی اور ان جیسے دیگر بہت سے الفاظ کی بار بار ضرورت پڑتی ہے۔

چوتھی منزل

اس کے بعد یہ منزل آتی ہے کہ زبان کی اچھی اور شوق انگیز کتابیں زیادہ سے زیادہ پڑھی جائیں، مضامین پڑھے جائیں، اخبارات کا مطالعہ کیا جائے، قصے کہانی کے مجموعے پڑھے جائیں اور غور و فکر توجہ اور جذبۂ تحصیل و اخذ کے ولولے کے ساتھ پڑھے جائیں۔ ہر کھلیان سے فائدہ اٹھایا جائے، ہر پھول سے رس چوسنے کی کوشش کی جائے اور "تمتع زہر گوشئہ یافتم" کی جیتی جاگتی تصویر بننے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

ہمارے استاذ اور عربی زبان کے معلم یگانہ: حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ زبان سیکھنے کے اِرادے سے جو کتاب بھی پڑھی جائے، انتہائی ڈوب کر پڑھی جائے اور غور سے الفاظ کے صلہ جات، افعال کے براہ راست تعدیے یا بذریعہ حروفِ جار تعدیے، ان کے متعدی بیک مفعول یا متعدی بدو وسہ مفعول ہونے، یا پہلے مفعول کی طرف براہ راست متعدی ہونے اور دوسرے کی طرف بذریعہ حرفِ جار متعدی ہونے کو ذہن میں اچھی طرح جمانا چاہیے۔

مثلاً "سمّی" کا لفظ کبھی دونوں مفعول بہ کی طرف براہ راست متعدی ہوتا ہے جیسے: سَمَّیْتُہُ رشیداً اور کبھی دوسرے کی طرف بذریعہ "ب" متعدی ہوتا ہے جیسے: سَمَّیْتُہ بِرَشِیْدٍ۔

اِسی طرح "سأل" کا لفظ دو معنوں میں آتا ہے: کسی سے کوئی چیز مانگنی؛ کسی سے کسی کے متعلق معلوم کرنا یعنی کسی سے کسی کا حال اور خبر وخیریت معلوم کرنا۔ پہلے معنی کے لیے دو مفعول بہ کی ضرورت ہوتی ہے: سَألتُہُ القَلَمَ (میں نے اس سے قلم مانگا) دوسرے معنی کے لیے ایک مفعول بہ آئے گا اور دوسرے پر "عن" داخل ہوگا: سألتُہ عن القلم (میں نے اس سے قلم کے متعلق پوچھا) بعض جگہ اردو تعبیر میں صلے کا استعمال ہوگا جب کہ عربی میں نہیں ہوگا۔ اب ایک ایسا طالب علم جو غور و خوض/کا عادی نہیں ہے، اس کو عربی میں ڈھالے گا تو اردو کے صلے کو عربی میں بھی استعمال کرے گا، جیسے: "میں نے راشد سے قلم چھین لیا"۔ یہاں راشد اور قلم کے بیچ میں "سے" ہے، لیکن عربی میں "سے" یعنی "من" نہیں آئے گا؛ بلکہ جس سے چھینا گیا ہے اور جو کچھ

چھینا جارہا ہے ؛ دونوں کی طرف فعلِ "سَلَبَ" براہ راست متعدی ہوگا اور کہا جائے گا : "سلبتُ راشداً القلمَ" لیکن اکثر طلبہ "سلبتُ من راشد القلمَ" لکھ اور بول بیٹھتے ہیں ؛ جو فحش غلطی ہے۔

بہت سے الفاظ مجہول الشکل اور معروف المعنی ہوتے ہیں، غور و خوض کے رسیا طالبِ علم اُنھیں بجلد ذہن نشین کر لیتے ہیں، لاپروا قسم کے طلبہ نگاہِ غلط انداز ڈال کر بڑی بے فکری سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مثلاً : " أُعْجِبْتُ بدار العلوم دیو بند" مجھے دار العلوم اچھا لگا، بھلا معلوم ہوا۔ اسی کو اگر معروف الشکل استعمال کریں، تو دار العلوم سے پہلے "بـ" نہیں لگائیں گے اور یوں کہیں گے : "أَعْجَبَتْنِي دارُ العلوم" اِس کا ترجمہ اردو میں وہی ہوگا جو ابھی کیا گیا۔

اول الذکر استعمال سے صفت کا صیغہ اسمِ مفعول ہی کے وزن پر تراشا جائے گا ؛ لیکن ترجمہ اسمِ فاعل کا ہوگا اور کہا جائے گا "أنا مُعْجَبٌ بدار العلوم "ترجمہ بعینہٖ وہی ہوگا جو ابھی ذکر کیا گیا۔

ثانی الذکر تعبیر سے اسمِ فاعل کا صیغہ استعمال ہوگا ؛ چنان چہ یوں کہا جائے گا : "دار العلوم مُعْجِبَةٌ لی "ترجمہ بعینہٖ وہی رہے گا۔

اِسی طرح یہ بھی ذہن میں اتارنے کی بات ہے کہ فعلِ متعدی بدو مفعول کو جب مجہول بنائیں گے، تو مفعولِ اول نائبِ فاعل بن کر مرفوع ہو جائے گا، جب کہ مفعولِ ثانی اپنی جگہ مفعول بر قرار رہے گا ؛ چنان چہ منصوب ہوگا جیسے : " سَمَّی المؤلفُ هذا الکتابَ الوقایةَ" کو مجہولاً یوں لکھیں گے اور پڑھیں گے : "سُمِّيَ هذا الکتابُ الوقایةَ" ہمارے طلبہ اس مسئلے پر بھی غور کے عادی نہیں۔

حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ ہر بات کتاب میں لکھی ہوتی ہے، اس کو بڑے غور سے پڑھنااور اخذ کرنا چاہیے۔ فرماتے تھے کہ طلبہ عموماً عبارت کو غور سے نہیں پڑھتے ؛ بلکہ فقہ، تفسیر اور علوم وفنون کی دیگر کتابوں کی طرح زبان کی کتابوں کو بھی اِس طرح پڑھتے ہیں کہ صرف کلی مفہوم اور معانی پر ہی توجہ دیتے ہیں، کسی لفظ یا عبارت کے معنی معلوم ہو جانے کو ہی زبان سیکھ لینا سمجھتے ہیں ؛ جو غلط ہے۔ زبان میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ افعال اور مصادر کے صلوں کا، بطورِ خاص خیال رکھا جائے۔ کسی لفظ کا صرف معنی معلوم ہونا، اُس وقت تک مفید نہیں جب تک کہ اس کا طریقۂ استعمال معلوم نہ ہو جائے۔

پانچویں منزل

عزیز طلبہ !

اس کے بعد آپ کو اب یہ کرنا ہے کہ پڑھیے، پھر لکھیے اور بولیے۔ بہت سے طلبہ ہمارے پاس آتے ہیں، پوچھتے ہیں کہ مضمون لکھنے کا طریقہ بتادیجیے۔ میں اُنھیں جو کچھ بتایا کرتا ہوں وہ آپ بھی سن لیجیے۔

ا- جو کچھ مطالعہ کیا جائے، اس کو اپنی بے تکلف زبان میں لکھ لیا جائے۔ اگر مطالعہ کردہ کتاب یا مضمون کی عبارت کہیں کہیں بیچ میں آجائے، تو کوئی حرج نہیں اور نہ آئے تب بھی کوئی نقصان نہیں ؛ اپنی تعبیر میں خیال کو ادا کر دیا جائے۔ اِس سلسلے میں تکلف، بناوٹ عبارت آرائی سے پرہیز کیا جائے۔ فطری طور پر لکھنے کی کوشش کی جائے اور اسی کی عادت ڈالی جائے۔ پھر یہی مزاج بن جاتا ہے اور انسان بے

تکلف، خوب صورت اور پر کشش زبان لکھنے لگتا ہے۔

۲- روزانہ کی ڈائری ضرور لکھی جائے، خواہ ایک ہی صفحہ سہی۔ آپ نے مہمانی کی، آپ تفریح کو گئے، سفر کیا، ملاقاتیں کیں، بازار سے اشیا خریدیں، کوئی واقعہ پیش آیا، غمی یا خوشی کی تقریبات ہوئیں، کسی کی تقریر سنی، خود کہیں تقریر کی، آثار قدیمہ دیکھنے گئے، کسی منظر کی دل فریبی، یا دل فگاری نے کوئی تاثر پیدا کیا، ریل گاڑی کی آمد اور مسافروں کی اسٹیشن پر ہماہمی، جہاز کی اڑان میں تاخیر سے پیدا شدہ صورتِ حال، سمندر کے ساحل کی سحر کاری، سیلاب کی تباہ کاری، خشک سالی کی جاں کاہی، ہری بھری کھیتی کی دلکشی، سبزے کی رونق افروزی، باغ کی بہار، پپیہے کی پکار، بلبل کی نوا، کھِلے ہوئے پھولوں کی خوش منظری و جنت نگاہی: یہ سبھی چیزیں مضامین آفریں، مواد ساماں اور اہلِ قلم کی دادِ توجہ کی مستحق ہیں۔ انھیں اپنے اسلوب، اپنے مبلغِ علم و زبان و مطالعہ کی روشنی میں بے تکلفانہ طور پر قیدِ تحریر میں لانے کی کوشش کیجیے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا روزانہ کا مطالعہ اور مذکورہ طرز پر روزانہ کی تحریر، آپ کو جلد ایک کامیاب لکھنے والا بنا سکتی ہے- پھر آپ کا ذوقِ طلب اور شوقِ سفر، آپ کو ایک اہلِ قلم، ادیب، صاحبِ طرز ادیب اور اعلیٰ درجے کا مصنف و مؤلف و محقق بنا سکتا ہے۔

۳- سراپا نگاری کی کوشش بھی کی جائے، یعنی جو چیز جس طرح ہے، اُسی طرح بیان کرنے اور قلم سے اس کا نقشہ کھینچنے پر توجہ دی جائے۔ آپ نے تاج محل کو کیسا پایا؟ جامع مسجد دہلی کیسی لگی؟ دہلی عموماً اور دہلیِ قدیم خصوصاً کیسی ہے؟ کوئی شہر یا دیہات کس خوبی یا خرابی کا

حامل ہے۔

۴- کوئی خیال، کوئی نظریہ، کوئی تاثر، جو آپ کے دل میں ابھرے؛ اپنے الفاظ میں اس کو ضرور لکھ لیجیے۔ اپنی بات کو اپنی زبان میں کہنا بہت آسان ہوتا ہے، اِس لیے اس آسان نسخے کو ہاتھ سے جانے نہ دیجیے۔

۵- کسی موضوع پر لکھے ہوئے مضمون کو پڑھ کر اسی طرح کا دوسرا مضمون گھٹا بڑھا کر لکھنا چاہیے۔ اس "ہیرا پھیری" سے بھی لکھنا آجاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ مذکورہ مضمون کو بار بار پڑھیے، غور کیجیے کہ اس میں کیا خامی ہے؟ کون سا گوشہ رہ گیا ہے؟ یا مضمون طویل ہے، لوگ پڑھ کر اکتا جاتے ہیں۔ اب آپ یہ کیجیے کہ نا تمام گوشوں کو مکمل کر دیجیے، حوالوں کی کمی کو پوری کر دیجیے، خامی کو دور کر دیجیے، طوالت کو ختم کر کے مضمون کی روح لے لیجیے، حشو و زوائد سے مبرا ایک اچھا سا مضمون بنا دیجیے، عنوان بدل دیجیے، ترتیب و تنسیق پہلے سے اچھی کر دیجیے۔

دس بیس مضامین کے ساتھ "ہیرا پھیری" کا یہ عمل، آپ کے قلم کو ایسا حوصلہ دے گا کہ آپ راہِ نگارش پر آگے قدم بڑھاتے چلے جائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

چھٹی منزل

دوستو!

لکھنے کا سلیقہ جب آجائے، قلم رواں ہو جائے اور "قط لگانے" کی

کچھ زیادہ ضرورت نہ رہ جائے، تو اس وقت یہ منزل آتی ہے کہ کسی ایک مصنف ہی کو زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے: اس کا اسلوب، رویہ، سلیقہ، طریقہ، رکھ رکھاؤ، مذاق، رجحان اور سمتِ قلم و قبلۂ تحریر کو سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی جائے۔ اس کی تحریر کے موسم اور ماحول میں جینے، جی لگانے اور اس سے دل لبھانے کا گر، سیکھا جائے۔

لیکن اس خصوص میں کسی "معرفت نگاہ" اسلامی شعور کے حامل، عالمی پیمانے پر دل و نگاہ کو آباد یا خراب کرنے کی مفسدہ پردازی سے باخبر، قلم کی دنیا کے "نیک نیت" یا "سود خور" تاجروں، "اہل کاروں" "ایجنٹوں"، یا کسی قیمت پر نہ بکنے والوں اور ہر کھوٹے سکے پر مر مٹنے والوں کی جان کاری رکھنے والے، پیغام الٰہی کا درد اور دعوتِ محمدی کا عشق رکھنے والے؛ کسی استاذ سے مشورہ ضروری ہے۔ اُنھی کے مشورے سے کسی ایسے اہلِ قلم کو پڑھنے اور پینے کے لیے انتخاب کیا جائے؛ جس کے یہاں زبان و قلب میں یکسانیت ہو، جس کے یہاں زبان سے زیادہ دین کی اہمیت ہو، جس کے دل لی تپش عبارت میں محسوس ہوتی ہو، جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پیار ہو، جس کو اسلام کے کشتیِ نجاتِ انسانیت ہونے پر یقین کامل ہو، جو مغربی تہذیب کی فسوں کاری سے نہ صرف آزاد ہو، بلکہ اس کی "تازہ ستم ایجادی" کے خلاف اس کا قلم شرربار بھی رہا ہو، جس کو اسلام کی علمی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی میراث سے محبت ہو؛ جس کو اسلام کے اولین محسنین: صحابہ کرام اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے علما، ائمہ، فقہا، صلحا، مجددین، مصنّفین اور خادمانِ علم و دین سے عقیدت ہو، یا کم از

کم وہ دشمنِ اسلام اور دینی روایات واقدار سے بیزار نہ ہو۔

حضرات!

یہ بہت ضروری ہے کہ پڑھتے وقت مصنف کا انتخاب کیا جائے، خصوصاً کچی عمر میں جو انفعال، تأثر، تعلّم اور تحصیل و جستجو کی عمر ہوتی ہے۔ بعض دفعہ بھکے ہوئے مصنف کو پڑھ کر آدمی اپنے دین ودنیا کو برباد کر بیٹھتا ہے۔ قلم کی جادو نگاری انسان کو صاحبِ قلم کا معتقد بنادیتی ہے، اگر وہ ذوق ورجحان کے اعتبار سے صراطِ مستقیم پر ہوتا ہے تو فبہا، ورنہ سرمایۂ دین وایمان واخلاق کا لٹیرا ثابت ہوتا ہے۔ ثانی الذکر مصنف کی تحریر میں ایک طرح کی ظلمت، نحوست، ویرانیت اور وحشت محسوس ہوتی ہے اور ''شاہ راہِ'' مضمون کے علاوہ سطروں کی ''پگڈنڈیوں''، بین السطور کی ''گلیوں'' اور مابین الالفاظ کے ''کوچوں'' میں بھی ہر جگہ، دین وایمان کے تازہ دم ڈاکوؤں اور ستم پیشہ و بے رحم قزاقوں کی ٹولیوں کے قدم ہائے ناپاک کی چاپ صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ایک حساس قاری اور باشعور مسلمان اس کی ایک سطر پڑھنے میں بھی بوجھ محسوس کرتا ہے۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن!
پُرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے

جب کہ اول الذکر اہلِ قلم کی سطر سطر روشنی میں نہائی، دودھ میں دھلی، قلب میں اترتی، دل میں گھر کرتی اور عقل کو شکار کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ کسی فن، آرٹ، یاادب وشعر میں خونِ جگر اگر

شامل نہ ہو، تو اس میں آب و تاب پیدا نہیں ہوتی؛ چہ جائے کہ اس کا سر چشمہ لادینیت، اخلاقی انارکی، اباحیت پسندی، فکری بے راہ روی، اور ذہنی عیاشی ہو۔ آج کا ادب عموماً اسی نوع کا ہے؛ اس لیے تلاش، احتساب اور انتخاب کی ضرورت ہے۔ خدا کی توفیق آپ کی ہم رکاب ہو، کہ شاعر کی نوا اور مغنی کے نفس کو بہار آفریں و جاں بخش ہونا چاہیے، نہ کہ باعث پژمردگی و افسردگیِ چمن۔

شاعر کی نوا ہوں کہ مغنی کا نفس ہو!
جس سے چمن افسردہ ہو، وہ بادِ سحر کیا

☆ ☆ ☆

(۳) تیسری چیز کسی لفظ کا صحیح املا ہے(۱) یعنی کسی زبان کے کسی لفظ کو اِس طرح لکھنا جس طرح اس زبان میں اسے لکھا جانا چاہیے۔ املا کی بڑی اہمیت ہے، اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو لفظ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ بعض دفعہ یہ سمجھنا دشوار ہوتا ہے کہ کس معنی میں مستعمل ہے؟

۱۔ "املا" کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے؛ لیکن اس کی تذکیر مُرَجَّح ہے۔ شیخ امیر اللہ لکھنوی تسلیم کا شعر ہے۔

عالم وحشت میں جب لکھا کوئی خطِ فراق
ربط بگڑا ، میری انشا کا غلط املا ہوا

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل حسن جلیل، اپنی کتاب "تذکیر و تانیث" میں لکھتے ہیں: "بعض لوگ اس کی تانیث کے بھی قائل ہیں، جیسا کہ رشک (فخر تلامذۂ ناسخ: میر علی اوسط لکھنوی متخلص بہ "رشک") کا شعر ہے

نامۂ جاناں ہے، یا لکھا مری تقدیر کا
خط کی انشا اور ہے، لکھنے کی املا اور ہے

"مگر ترجیح مذکر ہی کو ہے۔" ("تذکیر و تانیث" طبع اول ۱۳۲۶ھ)

یعنی نویسندہ ایک لفظ کو اس کے املا کے بر خلاف لکھ کر قاری کو (خصوصاً اگر وہ قواعدِ املا اور رموز املا کا عادی ہو اور ان کے بغیر کسی لفظ کے صحیح نقوش اس کے ذہن میں بمشکل تمام ابھر پاتے ہوں) ایک طرح کی الجھن میں ڈال دیتا ہے، بلکہ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے اس لفظ کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ پڑھ لے، جو نویسندہ کے نزدیک مقصود نہیں ہوتا۔ املا اور رموزِ املا کا استعمال اِس وقت دنیا کی تمام قابلِ ذکر زبانوں میں بڑی پابندی کے ساتھ ہونے لگا ہے۔ قدیم زمانے میں رموزِ املا کی طرف توجہ نہیں تھی؛ لیکن قواعدِ اِملا اور صحتِ کتابتِ الفاظ کی تو ہر زمانے میں سختی سے پابندی کی جاتی رہی ہے۔

اہلِ زبان قرآن پاک کے مخصوص اِملا کو اپنی عربی میں استعمال نہیں کرتے

عربی زبان کو تو خدائے پاک نے بطورِ خاص اس سعادت سے نوازا ہے کہ اس نے اس میں اپنی آخری اور دائمی کتاب نازل کر کے اس کی یعنی زبان کی ابدیت پر مہر لگادی اور قرآن پاک کی حفاظت کے ذیل میں عربی زبان کی حفاظت کا وعدہ کر لیا۔ قرآن پاک میں لفظ کی صورت اور املا ممتاز قسم کا ہے۔ مسلمانوں نے وقتِ نزول سے اب تک قرآن پاک کے املا کی بھی پابندی کی ہے اور اس سے سرمو انحراف گوارا نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ عربی زبان کا املا بطور خاص قابلِ لحاظ ہے اور عربی کو جس طرح چاہیں لکھنے لگیں اور اس کے جس

لفظ کی جو چاہیں من مانی صورت گری کریں ؛ یہ بہت ہی ناپسندہ فعل ہے جسے اس زبان کا کلچر اور اس میں نازل شدہ خدائی کتاب جس نے اس کے مستقبل کو مامون اور یقینی بنادیا ہے ؛ اِبا کرتی ہے۔

یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ قرآن پاک کے املا کو علما نے ، قرآن پاک کے ساتھ خاص رکھنے کی بھی کوشش کی ہے اور ان کا اس سلسلے میں یہ رویہ رہا ہے کہ اپنی عربی زبان کو وہ بہت سی جگہوں میں قرآن کریم کے املا سے مختلف املا کے ساتھ لکھتے رہے ہیں ؛ تاکہ عام قاری کو پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو ؛ چناں چہ لفظ جس طرح پڑھا جاتا ہے اسی طرح لکھنے کی کوشش کی جائے اس پر وہ کاربند رہے ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں "الصّلوٰۃ" واو پر کھڑے زبر کے ساتھ لکھا جائے گا، کیوں کہ کاتبینِ وحی نے اِسی طرح اس لفظ کا املا کیا تھا ؛ لیکن قرآن کے علاوہ ہماری آپ کی عربی میں یہ لفظ الف کے ساتھ "الصّلاۃ" لکھا جائے گا ؛ اس لیے کہ پڑھنے میں الف سے ہی پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح "کتٰب" کی لکھاوٹ قرآن پاک میں "ت" پر کھڑے زبر کے ساتھ ہے ، جب کہ ہم لوگ اپنی عربی میں اسے "کتاب" الف کے ساتھ لکھیں گے۔ اسی طرح "النّفّٰثٰت" قرآن پاک میں "ف" اور "ث" پر کھڑے زبر کے ساتھ ہے ؛ لیکن چوں کہ یہ دونوں کھڑے زبر، الف ہیں ؛ اس لیے ہم لوگ اپنی زبان میں "النّفّاثات" دونوں حرفوں کے بعد الف لگا کر لکھیں گے۔ "الیل" قرآن پاک میں ایک "لام" کے ساتھ ہے۔ لیکن ہم لوگ اپنی زبان میں دو لاموں کے ساتھ "اللّیل" لکھیں گے ، ورنہ ہمارا املا غلط سمجھا جائے گا۔

عربی زبان میں ہمزے کے اِملا کی اَہمیّت

عربی زبان میں ہمزے کے املا میں خاصی تفصیل اور پیچید گی ہے اور ہمزے کی کتابت کبھی کبھی اِعراب کے ساتھ ساتھ تبدیل بھی ہوتی رہتی ہے ؛اس لیے ہمزے کے املا کا تتبع کرنے اور اس کو بطورِ خاص سیکھنے کی ضرروت ہے۔

مثلاً ''سَاَلَ'' باب ''فتح'' سے آتا ہے اس کی ماضی معروف مذکورہ شکل میں لکھی جائے گی جب کہ ماضی مجہول ''سُئِلَ'' لکھی جائے گی، یعنی معروف ہونے کی صورت میں الف ''أ'' پر ہمزہ لکھا جائے گا اور مجہول ہونے کی حالت میں ''یا'' پر، یا یوں کہیے کہ شوشے پر لکھا جائے گا۔ جیسے : سُئِلَ۔

اسی طرح ہمزۂ متطرفہ، یعنی وہ ہمزہ جو کنارے میں آیا کرتا ہے، وہ ضمیرِ متصل سے ملانے کی صورت میں حسبِ اِعراب بدلا کرے گا۔ مثلاً : ''علماء '' کے آخر میں جو ہمزہ ہے اگر اِس لفظ کو ''ھا'' کے ساتھ یا''ہ'' کے ساتھ یا(ك کما کم) وغیرہ کے ساتھ لکھیں، تو بصورت حالتِ رفع ''واو'' پر ، بصورتِ نصب علاحدہ اور بصورتِ جر ''یا'' پر یعنی شوشے پر لکھا جائے گا۔ یعنی علماؤھا، علماءَ ھا اور علمائھا لکھا جائے گا۔

اسی طرح اگر ہمزہ قطعی ہے، تو الف کے ساتھ اس کا اظہار ہو گا اور ہمزہ لکھا جائے گا اور اگر وصلی ہو گا، تو محض الف لکھیں گے اور اس کے اوپر یا نیچے حرفِ ہمزہ لکھنے سے قطعی طور پر پرہیز کرنا پڑے گا۔ مثلاً

"الإسلام" میں (لا) کے الف کے نیچے ہمزہ لکھنا چاہیے ؛ لیکن "الاختیار" "الاقتتال" "الابن" "الاسم" وغیرہ کی الف کے نیچے نہیں لکھنا چاہیے۔

ہمزۂ وصلی اور ہمزۂ قطعی کی کتابت کے سلسلے میں ضروری ہدایات

ہمزۂ وصلی

ثلاثی مزید فیہ کے ساتوں باہمزۂ وصل ابواب :

(۱)افتعال= اجتناب (۲)استفعال= استنصار(۳) انفعال= انفطار (۴)افعلال = احمرار(۵)افعیلال= اِدھیمام (۶)افعیعال=اخشیشان (۷)افعوّال=اجلوّاذ

اور رباعی مزید فیہ کے دونوں باہمزۂ وصل ابواب :

(۱)اِفعِلاَّل=اقشعرار(۲) افعِنْلاَل=ابرنشاق :

ان سارے ابواب کی ماضی ، فعل امر ، اور مصدر میں جو ہمزے لکھے جائیں گے وہ محض بشکل الف "ا" رہیں گے ،ان کے نیچے ہمزے کی علامت "ء" نہیں بنائی جائے گی۔ اجتَنَبَ، اجتَنِبْ،اجتِناب، لکھا جائے گا۔إجتَنَبَ، إجتَنِبْ، إجتِنَاب، نہیں لکھا جائے گا۔

ثلاثی مجرد کے فعلِ امر کا ہمزہ بھی، وصلی ہوتا ہے ؛لہٰذا اس کے نیچے بھی حرفِ ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔

ابن، ابنة، اثنان، اثنتان ، امرؤ، امرأة ،وغیرہ کے شروع کا

ہمزہ بھی وصلی ہے ؛ اس لیے اس کے نیچے بھی ہمزہ لگانا ناجائز ہے۔
کسی نکرے کے شروع میں جو "ال" تعریف کا لگایا جاتا ہے، اُس کا الف بھی ہمزۂ وصل ہے ؛ چناں چہ اس کے نیچے بھی ہمزہ کی شکل نہیں بنانی چاہیے۔

ہمزۂ قطعی

برادرانِ عزیز!
اِسی طرح ہمزۂ قطعی کے لکھنے کے مستقل قواعد ہیں، جو فن کی کتابوں میں درج ہیں، اُنھیں پڑھنا چاہیے ؛ لیکن اگر آپ عربی کی کسی کتاب کو درساً یا مطالعتاً پڑھتے وقت غور سے پڑھیں، تو تھوڑے دنوں کے تتبع اور استقرا سے آپ اس کی صحیح کتابت اور املا کے طریقوں کو اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ ہم لوگوں نے اِس فن کی باقاعدہ کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے اور نہ کسی استاذ سے اس کو سیکھا ہے، بلکہ اساتذہ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر (کہ کتاب کو ہمیشہ بہت غور سے پڑھنی چاہیے اور اس کے ظاہرِ عبارت اور باطنِ معنیٰ : دونوں کو ذہن میں سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہیے) ہی یہ چیز حاصل کی ہے۔
میں یہاں ہمزۂ قطعی کے حوالے سے صرف چند اِشارات پر اکتفا کرتا ہوں :

شروع کلمے میں آنے والا ہمزہ

(۱) شروع کلمے میں جو ہمزۂ قطعی آئے گا وہ ہمیشہ الف کے اوپر

یا اس کے نیچے حرف ہمزہ کے ساتھ لکھا جائے گا، خواہ وہ مفتوح ہو، مضموم ہو، یا مکسور : أَقْدَمَ ، أُذِنَ، إِذَنْ۔ شروع کلمے میں واقع ہمزۂ قطعی سے پہلے اگر کوئی حرف "ل" یا "فَ" وغیرہ آجائے، تب بھی اس کا یہی املا رہے گا، یعنی الف کے اوپر یا نیچے حرفِ ہمزہ لکھا جائے گا: فإنّك، سأكونُ، لأسامة۔

اس قاعدہ سے صرف لَئِنْ، لِئَلاّ، هٰؤُلاءِ، مستثنیٰ ہیں کہ اگر اِن کلموں کے آغاز میں ہمزہ ہائے اوّلیں سے پہلے والے "ل" کو ہٹادیا جائے تو یہ ہمزہ الف " ا " کے اوپر یا نیچے لکھے جائیں گے۔ "ل" نے ان کی طرز املا بدل دی ہے۔

بیچ کلمے میں آنے والا ہمزہ

(۲) [الف] ہمزۂ متوسطہ (بیچ کلمے میں آنے والا ہمزہ) کو خود اس کی حرکت اور اس سے ماقبل کے حرف کی حرکت کے درمیان موازنے کی بنیاد پر لکھا جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسرے کو "نَبْرَۃ" یعنی شوشے سے مناسبت ہے، ضمّے کو واؤ سے اور فتحے کو الف سے اور سکون کو انفراد سے۔

چناں چہ "يَأْمُرُ" میں ہمزۂ متوسطہ ساکنہ کو الف پر لکھا گیا؛ کیوں کہ ہمزے سے پہلے کا فتحہ اس پر آنے والے سکون سے زیادہ طاقت ور ہے اور فتحے کے حسبِ حال الف ہی ہے۔

"مُؤْمِنٌ" میں ہمزۂ متوسطہ ساکنہ کو "واؤ" پر لکھا گیا؛ اس لیے کہ ہمزے کے ماقبل حرفِ میم پر آنے والا ضمہ، ہمزے کے سکون سے

زیادہ مؤثر ہے اور ضمہ کو واؤ سے ہی مناسبت ہے۔

"مِئْزَرٌ" میں ہمزۂ متوسطہ ساکنہ سے پہلے حرفِ میم پر آنے والا کسرہ، خود اس پر وارد ہونے والے سکون سے قوی ہے؛ اِس لیے ہمزے کو "نبْرَہْ" یعنی شوشے پر لکھا گیا؛ کیوں کہ کسرے کو اسی سے مناسبت ہے۔

[ب] ہمزۂ متوسطہ اگر ضمہ کے بعد مفتوح واقع ہوگا، تو "واؤ" پر لکھا جائے گا؛ اس لیے کہ ضمہ، فتحے سے زیادہ قوی ہے: "مُؤَنٌ"

[ج] ہمزۂ متوسطہ اگر کسرے کے بعد مفتوح آئے؛ تو نَبْرَہْ یعنی شوشے پر لکھا جائے گا؛ اس لیے کہ کسرہ، فتحے سے زیادہ قوی ہے: "فِئَةٌ"۔

[د] ہمزۂ متوسطہ اگر فتحے کے بعد مفتوح آئے، تو الف پر لکھا جائے گا: سَأَلَ۔

[ھ] ہمزۂ متوسطہ اگر سکون کے بعد مفتوح آئے، تو اس صورت میں بھی الف ہی پر لکھا جائے گا: "يَسْأَلُ"

[و] ہمزۂ متوسطہ اگر فتحے کے بعد مضموم آئے تو "واؤ" پر لکھا جائے گا؛ کیوں کہ ضمہ، فتحے سے زیادہ طاقت ور ہے: "يَقْرَؤُهُ"

[ز] ہمزۂ متوسطہ اگر کسرے کے بعد مضموم آئے، تو شوشے پر لکھا جائے گا؛ اس لیے کہ کسرہ، ضمّے سے زیادہ قوی ہے: "قَارِئُوْنَ"۔

[ح] ہمزۂ متوسطہ اگر ضمے کے بعد مضموم ہو، تو "واؤ" پر لکھا جائے گا: "نُؤُمٌ"۔

[ط] ہمزۂ متوسطہ اگر سکون کے بعد مضموم ہو، تو "واؤ" پر لکھا جائے گا: "لِقَاؤُهُ"۔

[ی] ہمزۂ متوسطہ اگر فتحے کے بعد مکسور ہو، تو شوشے پر لکھا

جائے گا: "مُطْمَئِنٌّ"

[ک] ہمزۂ متوسطہ اگر ضمے کے بعد مکسور ہو، تو شوشے پر لکھا جائے گا: "سُئِلَ"

[ل] ہمزۂ متوسطہ اگر کسرے کے بعد مکسور ہو، تو شوشے پر لکھا جائے گا: "مِئِیْنَ"

[م] ہمزۂ متوسطہ اگر سکون کے بعد مکسور ہو، تو شوشے پر لکھا جائے گا: "جُزْئِيٌّ"

[ن] ہمزۂ متوسطہ اگر فتحے کے بعد ساکن ہو، تو الف پر آئے گا: "مَأْلُوْفٌ"

[س] ہمزۂ متوسطہ اگر ضمے کے بعد ساکن ہو، تو "واؤ" پر لکھا جائے گا: "رُؤْيَةٌ"

[ع] ہمزۂ متوسطہ اگر کسرے کے بعد ساکن ہو، تو شوشے پر آئے گا: "بِئْرٌ"

برادرانِ عزیز!

اس سلسلے میں استثناءات بھی ہیں؛ لیکن جیسا کہ میں نے کہا میرا مقصد یہاں احاطہ نہیں ہے، بلکہ صرف اشارہ ہے۔ جو کچھ عرض کیا جارہا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو بیدار کیا جائے، آپ کی توجہ مبذول کرائی جائے۔

کلمے کے آخر میں آنے والا ہمزہ

(۳) ہمزۂ متطرفہ (یعنی کنارے میں واقع ہونے والا ہمزہ) اس کی

کتابت میں بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں بھی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہمزۂ متطرفہ اپنے ماقبل حرف کی حرکت کے مطابق لکھا جائے گا: چناں چہ کسرے کے بعد "یا" پر: "قُرِئَ"، فتحے کے بعد الف پر: نَشَأَ، ضمے کے بعد واو پر: "جَرُؤَ" لکھا جائے گا۔

رموزِ اوقاف سے بے اعتنائی

حضرات!

اس سلسلے میں بھی ہمارے مدرسوں میں، جس میں ایک تو زبان پر توجہ نہیں دی جاتی اور اگر دی جاتی ہے تو ناقص طور پر؛ خیال نہیں رکھا جاتا اور رموزِ اوقاف: (، ؛ " " ( ) [ ] — ...... — ! ؟ ! ؟ . .. :) وغیرہ کو تو بالکل ہی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر فضلائے مدارس "نئی سطر" کی اصطلاح و عمل سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ (نئی سطر کے شروع میں پانچ نقطے کے بقدر جگہ چھوڑنی چاہیے)۔ حد تو یہ ہے کہ اردو میں "بالکل" کو "بالکل"؛ "بالجبر" کو "بالجبر" لکھتے ہیں۔

عربی زبان قدرے نامانوس زبان ہے کہ یہ ہماری مادری زبان نہیں ہے، ہم اس کا اکتساب کرتے ہیں۔ ماں کی گود میں نہیں سیکھتے؛ لیکن اردو زبان، جو ہم برِ صغیر والوں میں سے اکثر کی مادری زبان ہے، ہم نے اسے اسلامی مواد سے مالا مال کر دیا ہے؛ غالباً بلکہ یقیناً عربی کے بعد اسلامی موضوعات پر جتنی کتابیں اس زبان میں موجود ہیں، کسی زبان میں نہیں؛

لیکن ہم میں سے قابل ذکر اکثریت اس کے ادب، کلچر اور قواعد و ضوابط سے بے بہرہ ہے۔ اس سلسلے میں شدید کوتاہی برتی جاری ہے بلکہ کہنے دیجیے کہ مجرمانہ غفلت کا ارتکاب کیا جارہا ہے۔ اس کے ادب و شعر سے غفلت بھی قابلِ معافی ہوتی اگر ہم کم از کم اس کو واجبی طور پر صحتِ املا و قواعد و رموز کے ساتھ لکھنے پر قادر ہوتے۔

"اسکیلئے" "انکیلئے" "جنکا" "انکو" "اسکو" "اسکے" "انپر" کب کا متروک ہو چکا؛ لیکن ہم لوگ اب تک "اس کے لیے" "ان کے لیے" "جن کا" "ان کو" "اس کو" "اس کے" "ان پر" لکھنے کے عادی نہیں بن سکے۔ اسی طرح "کیجیے" "لیجیے" "لیے" "دیے" وغیرہ یائے مجہول (یے) کے نیچے دو نقطوں کے ساتھ لکھے جائیں گے؛ یعنی ہر اُس لفظ کو جس کی یا سے پہلے زبر ہو، جب کہ "گئے" "آگئے" وغیرہ یائے مجہول پر ہمزے کے ساتھ لکھیں جائیں گے۔

پٹنہ، کلکتہ، ہمزہ، غمزہ، غزوہ ایسے الفاظ جن کے آخر میں ہائے ہوز مختفی ہے، مرکب جملوں میں ہائے مجہول کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ پہلے ان لفظوں کو مُرکّب جملوں میں بھی اور مفرداً بھی (ہ) کے ساتھ ہی لکھا جاتا تھا، صرف پڑھنے میں فرق ہوتا تھا کہ مفرداً (ہ) کے ساتھ پڑھتے تھے اور مُرکّباً (یے) کے ساتھ؛ لیکن اب مُرکّباً جس طرح پڑھا جاتا ہے، اسی طرح لکھا بھی جاتا ہے: میں پٹنے گیا تھا، کلکتے میں اچھی چائے پتّی ملتی ہے، ہمزے کی کتابت قدرے مشکل ہے، غمزے سے کام نہیں چلتا، اس غزوے میں بہت سے صحابہ شہید ہوے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوے ہی کو اپنانا چاہیے، وغیرہ۔

رموزِ اوقاف اور ان کے استعمال کے طریقے

رموزِ اوقاف کا تذکرہ زبان پر آگیا ہے، تو مختصراً عرض کردوں کہ یہ اپنے ناموں کے ساتھ اس طرح ہیں۔

رموز اوقاف	عربی نام	اردو نام	انگریزی نام
،	الشَّوْلَة	سکتہ (چھوٹا ٹھہراؤ)	COMMA
؛	الشَّوْلَةُ الْمَنْقُوْطَةُ	وقفہ (ٹھہراؤ)	Seme Colon
.	النقطة	ختمہ (وقفِ تام)	Full Stop
:	النقطتان	رابطہ	Colon
؟	علامة الاستفهام	سوالیہ نشان	Sign of Interogation
!	علامة الانفعال	ندائیہ، فجائیہ	Note of Exclamation
–	الشَّرْطَةُ	خط	Dash
" "	التضبيب	واوین	Inverted Commas
( )	القوسان او الهلالان	بین القوسین	Brackets

الشَّوْلَةُ کو عربی میں اب زیادہ تر الفاصلةُ، ج: الفواصل کہتے ہیں۔

رموزِ اوقاف کا مفصل طریقۂ استعمال املا و قواعد کے موضوع پر لکھی گئی عربی اور اردو کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، یہاں محض مثال کے طور پر ہر ایک علامت کی وضاحت کے لیے، صرف ایک دو جملوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ایک دو علامتیں ہیں، جو غیر اہم

ہیں ؛اس لیے نظر انداز کی جاتی ہیں۔

۱- سکتہ (،)

یہ مختصر ترین وقفے کی علامت ہے ؛ متکلم اِس جگہ اپنی سانس توڑتا تو ہے ؛ لیکن ٹھہرتا نہیں۔ یہ علامت سب سے زیادہ کثیر الاستعمال ہے، قدم قدم پر اس کی ضرورت ہوتی ہے، گویا یہ کسی بھی عبارت کا جزو لاینفک ہے۔ اس کا استعمال بہت سی جگہوں پر ہوتا ہے۔

(الف) خصوصاً الفاظِ معطوفہ کے درمیان۔ جیسے :

عربی مثال

الكلمةُ ثلاثةُ أقسامٍ : اسمٌ، و فعلٌ، و حرفٌ

اردو مثال

محبت، اخلاق، نرم خوئی اور دل جوئی کے ذریعے، مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ الفاظِ مفردہ کے عطف میں عربی میں تمام معطوفات سے پہلے کاما(،) اور حرفِ عطف (و) دونوں آئیں گے ؛ جب کہ اردو میں حرفِ عطف (اور) صرف آخری معطوف سے پہلے کاما(،) کے بغیر آئے گا، اس سے پہلے کے دیگر معطوفات اور معطوف علیہ کے درمیان صرف کاموں سے کام چلایا جائے گا، جیساکہ اوپر کی مثالوں سے عیاں ہے۔ اس پر خوب غور کر لیا جائے۔

(ب) مختلف جملہ ہائے معطوفہ کے درمیان بھی، کاما کا استعمال ہوتا ہے ؛ جیسے :

عربی مثال

الشمسُ طالعةٌ، والنسيمُ عليلٌ، والطيورُ مُغَرِّدَةٌ، والأزهارُ ضاحكةٌ.

اردو مثال

قرآن پاک خدا کی آخری کتاب ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی ہیں، اسلام خدا کا آخری دین ہے، حدیثِ رسول شریعت کی تفسیر ہے اور عربی زبان پر عبور، کتاب وسنت کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنے کی کلید ہے۔

(ج) شرط اور جزاء کے درمیان بھی کاما آتا ہے۔ جیسے:

عربی مثال

إذا فاتك الحياءُ، فَافْعَلْ مَاشِئْتَ.

اردو مثال

اگر ہم جانتے داغِ جدائی، نہ کرتے اتنی الفت تم سے بھائی۔

(د) کسی طویل جملے کے مختلف اجزاء کے درمیان بھی کاما استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

عربی مثال

شَهِدْتُ الاحتفالَ المِئَوِيَّ، الذی عَقَدَتْه جامعةُ دیوبند، عام ۱۹۸۰م، وشارکه مئات آلافٍ من الناسِ ، والذی لم تَشْهَدِ الْهِنْدُ مِثْلَه.

اردو مثال

میں گھر سے بازار گیا، بازار سے بس اڈے گیا، وہاں سے اسٹیشن گیا، اب اسٹیشن سے گھر واپس جاتا ہوں۔

ایک قادر الکلام واعظ نے، رات کو ایک بڑے جلسے میں، ایسی ایمان افروز تقریر کی کہ بہت سے سامعین آبدیدہ ہوگئے، درودیوار سے نعرہائے تحسین بلند ہوئے اور غیر مسلموں پر بھی اچھاخاصا اثر ہوا۔

(ھ) کسی عبارت اور شعر کے اندر طوالت یا الفاظ کے الٹ پھیر سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کو دور کرنے کے لیے بھی، کاما استعمال ہوتا ہے۔ جیسے :

عربی مثال

وَمَهْمَا يَكُنْ عِنْدَ امْرِئٍ مِنْ خَلِيْقَةٍ
وَإِنْ خَالَهَا تَخْفَىٰ عَلَى النَّاسِ ، تُعْلَمِ

وَلَوْ أَنَّمَا أَسْعَىٰ لأَدْنَىٰ مَعِيْشَةٍ
كَفَانِيْ ، وَلَمْ أَطْلُبْ ، قَلِيلٌ مِن الْمَالِ

اردو مثال

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن وخوبیِ ہوا ، کہیے
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار

۲-وقفہ (؛)

یہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں متکلم یا قاری کے لیے سکوت کے ساتھ، سانس لینی بھی جائز ہو۔

(الف) متعدد لفظوں کے درمیان جب سکتے کی علامت (،) لگی ہو، تو جملے کے آخری جزو سے پہلے وقفے کی علامت استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے :

عربی مثال

الرياضُ، ومكةُ المكرمةُ، والمدينةُ المنورةُ، وجدَّةُ، والطائفُ، والدمامُ ؛ جميعُ هذه المدنِ تقعُ في المملكةِ العربيةِ السعوديةِ.

اردو مثال

دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس ؛ یہ سبھی ہندوستان کے بڑے شہر ہیں۔

(ب) اگر جملہ کے مختلف اجزاء پر زیادہ زور دینا ہو تو وہاں بھی وقفہ (؛) استعمال کرتے ہیں۔ جیسے :

عربی مثال

اغْتَنِمْ خَمْسًا قبل خمس: شَبَابَك قَبْلَ هَرَمِكَ؛ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ؛ و فَرَاغَكَ قبلَ شُغْلِكَ؛ و غناك قبلَ فَقْرِكَ؛ وَ حَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ.

اردو مثال

آنا ، تو خفا آنا ؛ جانا ، تو رُلا جانا
آنا ہے ، تو کیا آنا ؛ جانا ہے ، تو کیا جانا
جو جاگے گا، سو پائے گا ؛ جو سوئے گا، وہ کھوئے گا۔

(ج) جب جملوں کے ایسے دو حصوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا ہو جن میں اندرونی طور پر سکتہ (،) موجود ہو۔ یعنی دونوں جملوں میں سکتے کی علامت کے ذریعے ایک ہی نوعیت کی، دو یا دو سے زائد باتیں کہی گئی ہوں ؛ ان کے درمیان وقفے کی علامت استعمال ہوتی ہے۔ جیسے :

عربی مثال

وَجَدْنَا النآسَ قَبْلَنَا كَانُوْا أَعْظَمَ أَجْسَاماً، وأوفرمع أَجْسَامِهِمْ أحلاماً؛ وأَشَدَّ قوة ، وأَحْسَنَ بقوتهم للأمور إتْقَاناً؛ وأطول أعماراً، وأفضلَ بأَعْمَارهم للأشْيَاء اختباراً ؛ فكان صاحب الدين في أمرين الدِين، أَحْسَنَ علماًوعملاً، من صاحب الدين منّا؛ وكان صاحبُ الدنيا عَلَىٰ مِثْلِ ذٰلِكَ مِنَ الْبَلاغَةِ وَالْفَضْلِ.

(الأدب الكبير لابنَ المقفع)

اردو مثال

ابن المقفع کی الادب الکبیر، الادب الصغیر، کلیله ودمنه؛ جاحظ کی البیان والتبیین، کتاب البخلاء ؛ عربی زبان وادب کی بہترین کتابیں ہیں۔

گنگا، جمنا، گھاگھرا اور گومتی شمالی ہند کی ؛ مہاندی، گوداوری، کرشنا اور کاویری ؛ جنوبی ہند کی بڑی ندیاں ہیں۔

۳- ختمہ (۔) = (.)

اس علامت کا استعمال، جملے کے مکمل ہونے کے وقت کیا جاتا ہے، جہاں قاری کے لیے بھرپور ٹھہراؤ کی گنجائش ہوتی ہے۔

یہاں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ انگریزی اور عربی زبانوں میں، جملے کی تکمیل کی علامت ؛ یعنی ختمہ یا فل اسٹاپ کو بتانے کے لیے نقطہ (.) استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں اِس کے لیے چھوٹا سا ڈیش (۔) استعمال کیا جاتا ہے۔

عربی مثال

هذه حقولٌ خَضْرَاءُ، وتِلْكَ أشجارٌ باسِقَةٌ نحن نُحِبُّ الخضرةَ حيثما وُجِدَتْ لأنها تُدْخِلُ السرورَ علي القلبِ وهناك أناسٌ لايُلْقُوْنَ إِلَيْهَا بالاً.

کسی کمال کے حصول کے لیے پیہم محنت ضروری ہے۔ ایک انسان اُسی وقت ترقی کرتا ہے، جب وہ آرام وراحت کو تج دیتا ہے۔ آرام پسند اور عافیت طلب آدمی کسی کام کا نہیں ہوتا۔

۴- رابطہ (:)

اس علامت کا استعمال، کسی کے قول یا کہاوت کی نقل، نیز جملے کی تفصیل سے پہلے یا مفصل کے اجمال سے پہلے ؛ ہوا کرتا ہے۔

عربی مثال

قَالَ لِيْ أُستَاذِيْ: لايُعْجِبُنِيْ مِنَ التِّلْمِيْذِ ذكاؤهُ إذالم يكن مُطِيْعاً، ويُعْجِبُنِيْ منه انقيادُه وتَأَهُّبُهُ لتنفيذِ تعليماتِ أُستَاذِهِ، مهما كان قليلَ الذكاء أو فاقداً له.

الكلمة تنقسم إلى ثلاثةِ أقسامٍ: اسمٍ ،وفعلٍ، وحرفٍ.

رُوِيَ عن النبيّ صلى الله عليه وسلم أنه قال: "الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ"

اردو مثال

بزرگوں کا قول ہے : "صبح کا بھولا شام کو گھر آئے، تو بھولا نہیں کہتے۔"

کیا خوب سودا نقد ہے : اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ (نظیر اکبر آبادی)

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے :
جو ہے راہِ عمل پر گامزن محبوبِ فطرت ہے۔

(علامہ اقبال)

۵- سوالیہ نشان (؟)

یہ علامت، سوالیہ جملوں کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ جیسے :

عربی مثال

الجاهلُ عدوُّ نفسه ، فكيف لايكون عَدُوَّ غيرِه؟

هَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ؟

اردو مثال

کیا آپ حج کو جارہے ہیں ؟ کیا کل مدرسے میں چھٹی ہے ؟ تم کون ہو ؟ کیا ہو ؟ تمھاری منزل کیا ہے ؟۔

۶- ندائیہ - فجائیہ (!)

(الف) یہ علامت، منادی ؛ یعنی جس کو پکارا جائے، کے بعد لگائی جاتی ہے۔ جیسے :

عربی مثال

أَيُّهَا السَّادَةُ ! أَوَدُّ أَنْ أَتَحَدَّثَ إِلَيْكُمْ الْيَوْمَ فِيْ مَوْضُوْعِ قَضِيَّةِ فَلَسْطِيْنَ.

يَا عبد الوحيد ! تفضل وَاشْرَبْ مَعَنَا الشَّايَ.

اردو مثال

حضرات!، سامعینِ با تمکین!، دوستو!، پیارے بچو !، لوگو!، حضرات وخواتین!

(ب) اسی علامت کو ان الفاظ اور جملوں کے بعد بھی استعمال کرتے ہیں، جن سے کسی جذبے کا اظہار مقصود ہوتا ہے ؛ جیسے ناراضگی، حقارت، استعجاب، خوف یا نفرت وغیرہ۔ اِس صورت میں اِس علامت کو ''فجائیہ'' کہا جاتا ہے۔ جیسے :

عربی مثال

هَيْهَاتَ أَنْ يَأْتِي الزَّمَانُ بمثله !

حذار حذارِ من بطشي وفتكي ! (الحريری)

إنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ! (القرآن الكريم)

ياحسرتاه! وَا لَهْفَا . !

إليك عنيّ !، عليكم بِتقْوَى اللهِ !

اردو مثال

"میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں!"

سبحان اللہ !، بہت خوب !، معاذ اللہ !، اُفوہ !

وہ اور رحم ! اِس کی امید فضول ہے۔

-جذبے کی شدّت کے وقت حسبِ ضرورت ایک سے زیادہ علامتیں بھی لگائی جاتی ہیں۔ جیسے :

عربی مثال

إِنَّ إِسرائيلَ صارتْ مُتَعَاطِفَةً مَعَ الْعَرَبِ فِيْ زَعْمِ أمِيْرِيْكَا!!

اردو مثال

سنا ہے کہ درندے، اب انسان کی جانوں کی حفاظت کا کام کریں گے !!

۷-خط (-)

(الف) اس علامت کا استعمال، جملۂ معترضہ کے شروع اور آخر میں کیا جاتا ہے۔ جیسے :

عربی مثال

اِعْلَمْ – أَرْشَدَكَ اللّٰهُ فِيْ الدَّارَيْنِ – أَنَّ الْكَلِمَةَ عَلَىٰ ثَلاثَةِ أَقْسَامٍ: اسْمٍ، و فِعْلٍ، و حَرْفٍ.

أَرَىٰ – وَ إِنْ كَانَ رَأْيِيْ مُتَوَاضِعاً – أَنْ لاَ تَسْتَعْجِلُوْا فِي الالْتِحَاقِ بِهٰذِهِ الْجَامِعَةِ.

اردو مثال

میری رائے ہے - اگرچہ میں کیا اور میری رائے کیا؟ - کہ آپ اِس سلسلے میں جلدی نہ کریں۔

خدائے پاک نے - جو قادر و عزیز ہے - اپنی کتاب کی حفاظت کی ضمانت لی ہے۔

(ب) جب کئی لفظ، کسی سابقہ لفظ کی تشریح میں لکھے جائیں، تو وہاں بھی یہ علامت لگائی جاتی ہے۔ جیسے :

عربی مثال

أَغْرَاضِيْ كُلُّهَا – بما فيها أثاثُ البيت ، والكتبُ، والملابسُ – قد جَاءَ عَلَيْهَا الْحَرِيْقُ.

اردو مثال

سارا شہر - درخت، مکانات، سڑکیں - کہرے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند - نہ صرف دارالعلوم دیوبند، بلکہ سارے مدارس اسلامیہ - اس وقت بنیاد پرستی کے الزام کی زد میں ہے۔

۸-واوین (" ")

(الف) کسی کتاب اور تحریر کا کوئی اقتباس نقل کرنا ہو یا کسی کا قول اسی کی زبان میں لکھنا ہو، تو اس کے شروع اور آخر میں واوین "" لگاتے ہیں۔ جیسے:

عربی مثال

نَصَحَنِيْ وَالِدِيْ فَقَالَ : " فَلذةَ كَبدِيْ، وَ قُرَّةَ عَيْنِيْ ! أَوَدُّ أن لا تألوَ جهداً في أداءِ الوظيفةِ التي من أجلها وَجَّهتُكَ إلى جامعةِ ديوبند"

قال محمد بن عمر المدائني في كتاب "القلم والدواة":

" يَجِبُ عَلَى الْكَاتِبِ أَنْ يَتَعَلَّمَ الْهِنْدِيَّةَ و غيرَها من الخطوطِ العجميةِ ، و يؤيد ذٰلك ... أن النبي صلى الله عليه وسلم أمر زيد بن ثابت أن يَتَعَلَّمَ كتابةَ السريانيَّةِ. فَتعلَّمَهَا... و كان يقرأ بها على النبيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُتُبَهُمْ" (صبح الأعشى في صناعة الانشاء)

اردو مثال

خواجہ الطاف حسین حالی میر تقی میرؔ کے اِس شعر کے متعلق لکھتے ہیں:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

"میرؔ نے باوجود غایت درجے کی سادگی کے، ایسے متبذل اور پامال

مضمون کو اچھوتے، نرالے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔"
(ب) کسی خاص اصطلاح، کتاب کے نام، انسانوں ، جگہوں اور شہروں کے نام کو بھی، واوین میں لکھا جاتا ہے۔ جیسے :

عربی مثال

" الإرْهَابِيَّةُ" مُصْطَلَحٌ ابْتَكَرَهُ الْغَرْبُ لِتَجْرِيْحِ المسلمين. سيّدنا "بلال" كان مؤذنَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم. "أترابراديش" أكبرُ ولاياتِ الهندِ بالقياس إلى الكثافةِ السُّكَّانِيَّةِ. "دهلى" عاصمةُ الهند وَ أَقْدَمُ مُدُنِهَا و أعْرَقُهَا حضارةً و ثقافةً. "صحيح البخارى" أصحّ الكُتُبِ بعد كتاب الله تعالى. كان الشيخ محمود حسن الديوبندي يُسَمّٰى بـ "شيخ الهند" والشيخ أشرف على التهانوي بـ "حكيم الأمة" و يُعْرَفُ الشيخ حسين أحمد المدنيّ بـ "شيخ الإسلام" و من قبلُ أُطْلِقَ هذا اللّقَبُ على ابنِ تَيْمِيَّةَ.

اردو مثال

حالی نے مرزا غالب کو "حیوان ظریف" کہا ہے۔
ہمارے بہت سے علما، مولانا سید محمد میاں دہلویؒ کو "حیوان کاتب" کہتے اور لکھتے تھے۔ بہت سے لوگ "اس کے لیے" کو "اسکیلیے" لکھتے ہیں؛ جو غلط ہے۔ "ہیولی" اور "صورت جسمیہ" فلسفۂ قدیم کی معرکۃ الآراء اصطلاحیں ہیں۔ "حلب" اور "حماۃ" شام کے دو شہروں کا نام ہے۔ "ہمالیہ" دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔

۹- قوسین ( ) [ ]

(الف) طویل جملۂ معترضہ، جس کے درمیان سکتوں کا استعمال کیا گیا ہو، کے شروع و آخر میں یہ علامت استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے :

عربی مثال

إن اللغةَ العربيةَ (وهي من أوسع اللغات انتشاراً، وأغزرهن مادة) قد اتَّسعَ صدرُها لجميعِ العلومِ والمعارفِ

اردو مثال

منی کے حادثے سے (جس کو عالمی ذرائع ابلاغ نے خاص مقصد کے تحت خوب اُچھالا، کچھ دانش ور مسلمانوں نے بھی اس پر زبان وقلم کی مشق کی اور نام نہاد سیکولر ذہن صحافیوں نے عرصے تک اس پر طبع آزمائی کی) سب سے زیادہ تکلیف قدرتی طور پر، مسلمانوں ہی کو ہوسکتی تھی اور ہوئی۔

(ب) کسی وضاحتی جملے یا لفظ کو؛ نیز کسی عبارت کو جس کی طرف توجہ مبذول کرانی مقصود ہو؛ قوسین کے درمیان لکھتے ہیں۔ جیسے :

عربی مثال

الجُحفَةُ (بضم الجيم وسكون الحاء المهملة) موضعٌ على ثلاثِ مراحلَ من مكة (مسالك الأبصار)

بين دهلي وديوبند (وهُمَا مدينتان في الهند) ۱۵۰ ك م.

اردو مثال

حضرت الامام مولانا نانوتویؒ کی کتابیں (جو سبھی مطبوعہ و متداول ہیں) اسلام کو عقلی دلائل کی روشنی میں، اس طرح پیش کرتیں ہیں کہ اس کی

حقانیت آئینہ ہو جاتی ہے۔

میرا قلم (جو میں نے کل ہی خریدا تھا) کہیں غائب ہو گیا۔

جگر مراد آبادی (مشہور شاعر) اپنے سینے میں گداز دل رکھتے تھے۔

بعض لوگوں نے خط اور قوسین کو ایک دوسرے کا ہم رتبہ مان کر یہ فیصلہ دیا ہے کہ دونوں ہی جملۂ معترضہ کے لیے استعمال ہوں گے۔ کاتب کے ذوق ورجحان پر منحصر ہے کہ وہ خط کا استعمال کرے یا قوسین کا؛ لیکن میرا مطالعہ یہ ہے کہ قوسین کا استعمال صرف طویل جملہ معترضہ ہی کے لیے کرنا چاہیے یا تشریحی جملوں اور الفاظ کے لیے، جیسا کہ مثالوں میں آپ نے دیکھا۔ چھوٹے جملۂ معترضہ کے لیے اور دیگر اُن مقاصد کے لیے، جو اپنے موقع پر ذکر کی گئی ہیں؛ خط ہی استعمال کرنا چاہیے۔

حضرات!

میں نے لاشعوری طور پر اردو کے قلم رو میں، قدم رکھ دیا تھا؛ ورنہ اس وقت موضوع تو عربی زبان تھا؛ لیکن جو کچھ کہا گیا وہ فائدے سے خالی نہیں۔

☆ ☆ ☆

(۴) چوتھی چیز: تلفظ اور صحت ادا ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ جو لفظ جس طرح زبان سے ادا ہونا چاہیے، اسی طرح ادا کیا جائے۔ عربی زبان میں تو اس کی شدید ضرورت ہے کہ صحتِ تلفظ کی پابندی کی جائے کہ اس زبان کو یہ فخر ہے کہ اس کے بولنے والے فطرتاً صحتِ تلفظ وادا کے عادی ہوتے ہیں اور قرآن پاک کو صحتِ ادا کے ساتھ پڑھنے

اور تلاوت کرنے کے لیے تو علما نے اتنی ساری کتابیں لکھی ہیں کہ ان سے قدیم زمانے ہی میں ایک زبردست کتب خانہ تیار ہو چکا ہے۔ علم تجوید و قراءت پر بعض کتابیں کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی گئی ہیں اور قرآن پاک کے ایک ایک لفظ، بلکہ ہر ہر حرف کو ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ دنیا کی کسی زبان کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ اس کے الفاظ و حروف کی ادائے گی کی حد بندی کی گئی ہو۔ اس کے صوتی، آہنگ اور مخارجِ حروف کے سلسلے میں اس درجہ دقّتِ نظر و عمل و تطبیق سے کام لیا گیا ہو۔ اس کے حروف و الفاظ کے ادا کرنے کی مدت، مقدار اور معیار کا تعین کیا گیا ہو۔

ایسی صورت میں اگر ہم ض، ذ، ز، ظ، وغیرہ کے فرق کو ملحوظ نہ رکھیں۔ حد یہ کہ ج، کو بھی انھیں حروف میں سے کسی کے مخرج سے ادا کریں اور ہ، ح، کا امتیاز ختم کر دیں ؛ ق، اور ک، کے حدِّ فاصل سے بیزار رہیں ؛ س اور ش کے درمیان قائم حدوں کو پھلانگ جائیں ؛ س، ص، ث، ت، ط، ع، اً، کی مختلف شکلوں کو بلا ضرورت کی بات سمجھ کر متحد المخارج کر دیں اور سرکاری اسکولوں کے ماسٹروں کی طرح ایک لفظ کو دوسرے کے مخرج سے ادا کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کریں، بلکہ عربی کو اردو میں پڑھیں ؛ تو یہ بڑے ظلم کی بات ہو گی اور ہمارا رویہ نہایت غیر ذمے دارانہ سمجھا جائے گا۔

مار پڑنے کے بجائے خارش

اگر ہم قراءات و تجوید کے تفصیلی قواعد کو پڑھنے اور ہضم کرنے کا

وقت، نہ نکال سکیں تو کم از کم حروفِ تہجی کے مخارج کو عملی طور پر جاننے کی کوشش تو کریں، تاکہ عربی کو عربی ہی زبان میں پڑھ سکیں۔ یقیناً اس حد تک علمِ تجوید و قراءت کا جاننا فرض ہے، کہ اس کے بغیر عربی کو ذرا بہت بھی صحیح پڑھنا متصوّر نہیں۔ اس کے بغیر کوئی گفتگو یا تقریر کسی بھی عربی داں کے لیے غیر مفہوم رہے گی۔ اگر آپ (یضرب) کو (یجرب) پڑھیں تو مار پڑنے کے بجائے خارش ہو جائے گی اور اگر (یفعل) کو (یفأل) ادا کریں تو اس عمل سے کسی نیک فالی کی توقع بے سود ہے۔ اسی طرح (یشکو) کو (یسکر) تلفظ کریں، تو یہ آپ کی بدمستی ہو گی۔

☆ ☆ ☆

(۵) پانچویں چیز: حسنِ تحریر ہے اس سلسلے میں بھی ہمارے ہاں غفلت شعاری عام ہوتی جا رہی ہے۔ آپ خطاط نہ بن سکتے ہوں نہ بنیں، کہ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، لیکن اس قدر حسنِ خط کا اہتمام و التزام تو ہر نویسندہ اور اہلِ قلم کے لیے ضروری ہے، کہ وہ جو کچھ لکھے وہی کچھ پڑھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لکھے کچھ اور اس کی بد خطی کی وجہ سے پڑھا جائے کچھ اور۔ ہمارے ایک ظریف دوست بتایا کرتے ہیں کہ ان کے ایک متعارف خاصے بد خط ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے بازار سے کسی چیز کے لانے کی درخواست کی، میں نے کہا کہ آپ لکھ کر دے دیجیے تاکہ یاد رہے، ورنہ میں بھول جاؤں گا۔ انھوں نے ایسا لکھا کہ مجھ سے جو کچھ پڑھا جاتا تھا، وہ ''سیکو فائیو'' کا لفظ تھا اور ''سیکو فائیو'' ایک گھڑی ہوا کرتی ہے، جو ان کا مقصود نہیں تھی۔ میں

نے واپس آکر ان سے کہا کہ بندۂ خدا! تم نے یہ "سیکو فائیو" لکھ کر کیوں دے دیا تھا، تم نے تذکرہ تو اس کے علاوہ کسی چیز کے لادینے کا کیا تھا؟!۔

الغرض اس طرح کی بدخطی مناسب نہیں اور آج کل یہی کچھ ہو رہا ہے۔

برادرانِ عزیز! پہلے کے علما اور اہلِ قلم کی تحریر، بہت پاکیزہ اور پرکشش ہوتی تھی۔ ایک قاری کو خواہ مخواہ بھی اسے پڑھنے کی خواہش ہوتی تھی اور جب پڑھتا تھا تو اس کو فائدہ ہوتا تھا۔ اب ٹائپ رائٹر اور اِدھر کچھ سالوں سے کمپیوٹر کی برتری نے بھی بدخطی میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ لوگ اپنے قلم اور ہاتھ کو استعمال کرنے کی "مجبوری" سے چھٹکارا حاصل کرتے جارہے ہیں۔ بہت سے لوگ تو کمپیوٹر اور ٹائپ رائٹر پر ہی مضمون اور خط لکھنے لگے ہیں؛ لیکن ابھی یہ صورتِ حال شاذ ہے، عام نہیں ہوئی ہے؛ لیکن شاید وہ دن دور نہیں، کہ لوگوں کو کمپیوٹر کی سہولت اِس درجہ حاصل ہوجائے کہ خاصی تعداد میں لوگ خطوط نویسی اور مضمون نگاری کے لیے بھی اسے استعمال کرنے لگیں؛ لیکن پھر بھی ہاتھ سے لکھنے کی ضرورت بالکلیہ ختم نہیں ہوسکے گی، کہ ہر وقت اور ہر جگہ کمپیوٹر کا پایا جانا حد درجہ ترقی کے دور میں بھی مشکل ہوگا۔ پھر یہ کہ ہر تحریر کو براہ راست اسی پر لکھنے کے لیے انسان کو پہلے اس کی عادت ڈالنی ہوگی، ورنہ کسی معقول تحریر کے لیے اس کا ذہن کام نہیں کرسکے گا، ٹھیک اسی طرح جس طرح ان لوگوں کو مضمون کی آمد اِملا کرانے میں نہیں ہوا کرتی جو اِملا کرانے کے عادی نہیں ہوتے؛

کیوں کہ ان کا ذہن انھی کے قلم کو مضمون دینے کا عادی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی صاحب کو مضمون املا کرانے کی عادت ہو جائے اور وہ اپنے ہاتھ سے لکھنے کے عادی نہ رہیں، تو ان کا ذہن ان کے قلم کو کچھ نہیں دیتا۔

حسنِ خط انسان کا زیور ہے

طلبۂ عزیز! حسنِ خط، انسان کا بہت خوب صورت زیور ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے لیے زیبا نہیں کہ وہ بد خطی کے مرض میں مبتلا ہو۔ اگر خدانہ خواستہ مبتلا ہو تو اسے "زود اثر دواؤں" کے ذریعے اس کا اِزالہ کرنا چاہیے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں، میں حسنِ خط کا اس درجہ رسیا تھا کہ جس طالبِ علم، بلکہ عالم کا خط بُرا دیکھتا تھا، تو مجھے اس کے علم کے متعلق بدظنی ہو جایا کرتی تھی اور مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ اس کو کچھ بھی آتا پاتا نہیں ہے، یہ جاہل مطلق ہے۔ جب اس نے اپنا خط تک درست نہیں کیا، سطریں ٹیڑھی میڑھی ہوتی ہیں، حد یہ کہ املا تک درست نہیں ہے، تو اس نے خاک پڑھا ہوگا! لیکن بعد میں میرا یہ نظریہ تبدیل ہو گیا جب کثرتِ نگارش کی وجہ سے میری اپنی تحریر بھی خامی آلود ہو گئی اور بعض خاصے اہلِ علم کی بد خطی کا بھی تجربہ ہو گیا؛ لیکن اس کے باوجود بد خطی اور املائی غلطیاں میرے حلق سے نیچے نہیں اُترتیں اور کسی بد خط فاضل کے متعلق تاہنوز اپنے "عقیدے" کی کوئی خاص تصحیح نہیں کر سکا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں میرا یہ یقین ہے کہ بد خطی اندرونی نفسیاتی اور ذہنی خامیوں، انتشار اور بے ترتیبی کی عکاس

ہوتی ہے۔(۱) جیسا کہ میرا خیال ہے کہ جو آدمی چائے کا اچھا ذوق نہیں رکھتا اور اچھی بری چائے میں تمیز کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ غالباً حسِ سلیم سے محروم ہوا کرتا ہے۔ یہ "غالباً" بھی میں نے از راہِ احتیاط استعمال کیا ہے، تاکہ آپ کے مجمع میں کسی صاحب کو الجھن نہ ہو۔

---

(۱) علمائے نفسیات، اِنسان کی خوش خطی اور اس کی بد خطی سے، اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ کر لیتے ہیں ؛ کیوں کہ انسان کے نفسیاتی خصائص و امتیازات اس کے ظاہری اعمال و احوال میں مجسم ہو جایا کرتے ہیں۔

(الف) ان کا کہنا ہے کہ سیدھی سطریں، کاتب کی سلامت روی اور گرد و پیش سے باخبری ؛ نیز نقصانات و خطرات کے حوالے سے اس کی پیش بندی کی علامت ہیں۔

(ب) چڑھتی ہوئی سطریں (جو نیچے سے اوپر کی طرف کو چڑھنے لگتی ہیں) جذبۂ اقدام اور ہمت و حوصلے کی غماز ہوتی ہیں۔ انھوں نے تجربے سے یہ ریکارڈ کیا ہے کہ بڑے بڑے تاجر اور کاروباری لوگ ؛ جو اپنی ذاتی محنت و عرق ریزی سے مال و دولت کی دنیا میں، اپنا نام روشن کر گئے، ان کی تحریروں کی سطریں، سیدھی شروع ہو کر آہستہ آہستہ اوپر کو چڑھتی ہوئی ہوتی تھیں۔

(ج) اس کے برخلاف اوپر سے نیچے کو اترتی ہوئی سطریں (جو سیدھی شروع ہو کر آہستہ آہستہ نیچے کو مڑتی چلی جاتی ہیں) نویسندہ کی قناعت پسندی، گم نامی یا بے نامی کو بتاتی ہیں ؛ چناں چہ خواتین کی تحریریں عموماً اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

(د) ٹیڑھی میڑھی تحریر ؛ جو کبھی چڑھتی اور کبھی اترتی ہوئی نظر آتی ہے، نویسندہ کے ذہنی تردد، قوتِ فیصلہ کی کمی، الجھاؤ، نفسیاتی دباؤ اور نا معلوم وحشت کی عَلامت ہوتی ہے۔

(ہ) متوازن حروف والی تحریر، جس میں کاٹ چھانٹ نہ ہو، نویسندہ کی نستعلیقیت، نظافتِ طبع، سلیقہ مندی اور ترتیب پسندی کو ظاہر کرتی ہے۔

(و) حروف کی خوب صورتی اور نشست، اگر مطبع کے حروف کی طرح ہوں، تو اس سے کاتب کے صبر شعار، ٹھنڈے مزاج اور متین طبع ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اگر ج، ح، خ کے دائرے کی صحیح گولائی ؛ س، ش، کے شوشوں اور الف کی ایستادگی پر توجہ دی گئی ہو۔

(ز) الفاظ کے آخری حروف کی درازی، خصوصاً ج، ح، ع، غ، ی ؛ نویسندہ کے مبالغہ پسند، فضول خرچ اور عیش کوش ہونے کو بتاتی ہے۔

(باقی اگلے صفحے پر)

حسنِ خط کے چند زریں فائدے

برادرانِ عزیز!

علمانے حسنِ خط کے بے پناہ فائدے بیان کیے ہیں، اُنھیں کہاں تک گنایا جائے۔ زمانے کے حالات اور مادی ترقیات نے انسانوں کے لیے اتنے مشاغل پیدا کر دیے ہیں کہ کسی کو سنجیدہ کام کے لیے فرصت نہیں؛ اسی لیے ہم آپ جلد باز ہو گئے ہیں۔ بہر کیف چند فائدوں کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے:

(الف) تحصیلِ حسنِ خط، طالب علم کو باعزت تنافس کی دعوت

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ حاشیہ)

(ح) تحریر کے حروف کا ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا؛ جیسے کاف الف سے جڑ جائے اور الف لامِ تعریف سے مل جائے؛ کاتب کی عجلت پسندی و جلد بازی کو بتاتا ہے۔

(ط) تحریر کے حروف کا توازن اور شکل و صورت کا اعتدال، کاتب کی معتدل المزاجی استقامتِ طبع، حلم جوئی، نرم خوئی، خوش اخلاقی اور وسیع القلبی کو بتاتا ہے۔

(ی) چھوٹے چھوٹے حروف والی مرتب تحریر، جس کے الفاظ اور سطروں کے مابین فاصلے ہوں، لطیف المزاجی اور جذبات کی پاکیزگی کی غماز ہوتی ہے۔

(ک) جس کی تحریر کے حروف بڑے اور الفاظ کے درمیان فاصلے ہوں، وہ سخی اور فضول خرچ ہوتا ہے۔

(ل) باریک الفاظ والی تحریر جس کے الفاظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں؛ عموماً اس کا لکھنے والا جزرس، بخیل، لالچی یا کم خرچ ہوتا ہے۔

(م) جس کی تحریر کے حروف کھڑے اور الف لام وغیرہ پائے کی طرح ہوں، تو وہ بحث و مباحثے اور مشقتوں کا عادی ہوتا ہے۔

(ن) بعض لوگوں کی تحریروں میں "ف" اور "ب" کے مابین امتیاز نہیں ہو پاتا، اور "س" یا دائروں والے حروف کے دائرے غیر واضح ہوتے ہیں؛ اس قسم کے لوگ جلد باز اور اپنی ذات کے سلسلے میں لاپروا ہوتے ہیں۔

دیتا ہے اوراس تنافس کی بنیاد پر وہ آئندہ زندگی میں سرگرم عمل ہو کر باکمال بن جاتا ہے، اپنے ہم عصروں سے بڑھ جاتا ہے اور آخرش تاریخ میں اپنا نقش ثبت کر جاتا ہے۔

(ب) تحصیلِ خوش خطی میں، ٹھیک ٹھیک نقل اتارنے کے لیے بڑے غور سے دیکھنے اور بصری صلاحیتوں کو تمام حواس کے ساتھ مجتمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ؛اس لیے طالب علم میں باریک بینی کی غیر معمولی صلاحیت پروان چڑھتی ہے، جس کی زندگی کے مختلف میدانوں میں قدم قدم پر ضرورت ہوتی ہے۔

(ج) تحصیلِ حسنِ خط کے لیے، مربوط اور مسلسل کوشش انسان کو، صبر و قرار، مشقت انگیزی، لچک، بیداری وغیرہ کا عادی بنادیتی ہے : یہ چیزیں زندگی جینے کے لیے بنیادی عناصر ہیں۔

(د) بعض دفعہ طالب علم، استاذ کے دیے ہوئے سبق یا کسی خطاط کی مطلوبہ تحریر کی نقل سے، بار بار کی کوشش کے بعد بھی عاجز رہ جاتا ہے۔ اس وقت ذہنی طور پر تسلیم کرتا ہے کہ وہ ناقص اور جس کی تحریر کی وہ نقل کیا چاہتا ہے، وہ کامل ہے ؛ اس طرح حق کو تسلیم کرنے اور اپنی ذات کے سلسلے میں بمقابلہ غیر، صحیح فیصلہ کرنے کا عادی بن جاتا ہے۔ ایک داعی، مصلح، قائد، معلم، مربی، اور صحیح مسلمان کو اس کی ہر وقت ضرورت ہے۔

(ھ) تحصیلِ حسنِ خط سے جمال پسندی کا ملکہ بھی پروان چڑھتا ہے ؛ کیوں کہ خوش خطی ایک آرٹ، پینٹنگ، نقش نگاری، اور لوح نویسی کا عمل ہے۔ احساسِ جمال اور قدر افزائیِ لطافت و نفاست ایک

پاکیزہ صفت ہے۔ اس کے ذریعے انسان اچھے بُرے میں تمیز کرتا ہے، معایب و محاسن کے ساتھ صحیح برتاؤ کرتا ہے اور احساسِ جمال اس کی زندگی اور کیرکٹر پر منعکس ہو کر، اس کے مزاج و مذاق کو ہم آہنگی و توازن کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

برادرانِ عزیز!

خوش خطی بعض دفعہ انسان کے بڑے بڑے کام کرادیتی ہے: ملازمت دلادیتی ہے، لوگوں کو اس کا معتقد بنادیتی ہے، آئی ہوئی بلا کو ٹال دیتی ہے۔ جب کہ بد خطی، حصے میں آئی ہوئی خوش قسمتی کو چھین لیتی ہے، اجتماعی اور ملازمتی زندگی میں رکاوٹیں کھڑی کردیتی ہے، انسان سے، جو غائبانہ اعتقاد اور حسن ظن ہوتا ہے، بعض دفعہ اس کی بدخطی کو دیکھ کر اس اِعتقاد کا محل یکلخت زمیں بوس ہو جاتا ہے۔

بعض دفعہ بد خط طالب علم باصلاحیت، ذہین، مطیع، صالح، اور تمام خوبیوں کا حامل ہونے کے باوجود امتحان میں فیل ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ اساتذہ اغلبًا، اس کی بدخطی کی وجہ سے، اس کی تحریر کو بلا پڑھے ایک طرف کو ڈال دیتے ہیں، کہ بھلا اس نے بھی کچھ لکھا لکھایا ہوگا؟! اور پڑھتے ہیں تب بھی ان کے احساسِ نازک کے آبگینے کو ٹھیس سی لگتی ہے اور منفی تاثر کی وجہ سے بہت کم نمبر دیتے ہیں۔ یہی طالب علم، اگر خوش خط ہوتا ہے، تو اپنی مذکورہ خوبیوں کے ساتھ اعلی درجے کی کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔

حسنِ خط، حسنِ انشاو تالیف کی طرح قاری کی زبان سے، نویسندہ کے لیے بے ساختہ، لاتعداد اور پیہم دعائیں دلواتا ہے۔ اس کے ضمیر کی

لذت، اس کے آنکھوں کی ٹھنڈک، اس کے دل کا سرور، اس کے نفس کا انبساط؛ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ انگ انگ سے اس کو دعائیں دے۔

عزیز طلبہ!

آخری بات یہ کہ خوش خطی، بذات خود ذریعۂ معاش رہی ہے اور رہے گی: بینروں، اعلانات، اشتہارات، سائن بورڈوں، طغروں، کی بہر کیف ضرورت رہے گی، خواہ کتاب کی کتابت کی ضرورت نہ رہے (اگرچہ اس سلسلے میں بھی کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ یہ تجربے میں آچکا ہے کہ کم از کم اردو نستعلیق کی حد تک خطاط کی کتابت میں جو حسن ہے، وہ کمپیوٹر کے ترقی یافتہ نستعلیق میں تا ہنوز، پیدا نہیں کیا جاسکا ہے)

آپ کو شاید نہیں معلوم کہ جس وقت، عثمانی خلافت کے زمانے میں ترکی میں پہلا پریس آیا، تو شہر استنبول کے سارے خوش نویس سڑکوں پر نکل آئے، اس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا، اُنھوں نے اپنے دوات، قلم اور آلاتِ خوش نویسی کو لاش کی شکل میں لے کر سڑکوں اور گلیوں میں گھمایا؛ کیوں کہ ان کو اندیشہ ہوا کہ ان کی بد قسمتی اور حرماں نصیبی کے دن آچکے ہیں۔

لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اِس وقت دنیا کے شہر شہر میں ہزاروں پریس ہیں، صرف دہلی شہر میں عجب نہیں کہ ۲-۳ لاکھ پریس ہوں اور کمپیوٹر کی توریل پیل ہوتی جارہی ہے؛ لیکن نہ کاتب کا بازار ٹھنڈا پڑا، نہ خوش نویس کی روزی روٹی کے لالے پڑے، نہ خطاط کی دنیا اجڑی، نہ کسی لوح نویس، پینٹر، ٹائیٹل ساز اور خاکہ نگار کے گھر میں خاک اڑی۔

بلکہ آج بھی کتاب کے عنوان کی اچھی کتابت، ٹائیٹل کی دلکش نقش نگاری اور کسی پیاری کتاب کی پر نور کتابت کے لیے، کسی خطاط ہی کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہے۔

بہر کیف میرا مقصد تو یہ ہے کہ حسنِ خط، زبان وادب کا ایک اٹوٹ انگ ہے؛ اس لیے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا اور نہ کرنا چاہیے۔ کسی عربی کے شاعر نے راہِ ادب کے مسافر کو مخاطب کرتے ہوئے کتنی اچھی بات کہی ہے:

تَعلَّمْ قِوامَ الْخَطِّ یَا ذَا التَّأدُّبِ
فَمَا الْخَطُّ إلاَّزِیْنَةَ الْمُتَأدِّبِ
فَإنْ کُنْتَ ذَامَالٍ، فَحَظُّكَ وافِرٌ
وَإنْ کُنْتَ مُحْتَاجاً فَأفْضَلُ مَکْسَبِ

مشہور عباسی ادیب عبداللہ بن المقفع کا قول ہے:
"الخطُّ لِلأَمیرِ جمالٌ، وللغنِيِّ کمالٌ، وللفقیر مالٌ"

بدخطی سے ہم لوگوں کی اِس درجہ بیزاری کی وجہ

بدخطی سے ہم لوگوں کی اِس درجہ بیزاری اور حسن خط پر اِس قدر فریفتگی، غالباً ہمارے اُن اساتذہ کا فیضان ہے، جن کی ذات و صفات و کمالات سے میں بطور خاص متاثر ہوا کہ اُن میں سے کوئی بھی نہ صرف یہ کہ بد خط نہیں تھے، بلکہ الحمد للہ اعلیٰ درجے کا پاکیزہ ذوق، حسنِ خط کے سلسلے میں وہ رکھتے تھے۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میرے مکتب کے مُلّا: مولوی ابراہیم (عرف مولوی "ٹھگن") بھی خاصے خوش خط تھے۔

ہم لوگوں نے مکتب میں حروفِ تہجی، بلکہ مرکب عبارتوں کا املا بھی لکڑی کی تختیوں پر سیکھا تھا، جن پر بچوں کا نرم ہاتھ زیادہ اچھی طرح بیٹھتا ہے اور حروف کی نشست صحیح طور پر سیکھی جا سکتی ہے۔ اب تو مٹی کی پلیٹوں کی طرح (جو ہمارے گھروں سے پتہ نہیں کب اور کس کے حکم سے، ہمیشہ کے لیے اٹھ گئیں) ہمارے مکتب سے، تختیوں کا رواج ہی جاتا رہا، بلکہ اب تو مکتب ہی کا بابرکت رواج ختم ہو گیا۔ اب تو ہر جگہ چندے اور دھندے کے "مدرسوں" نے لے لی ہے۔ ہر گاؤں میں جامعہ (یونیورسٹی) قائم ہو رہی ہے۔ اب "مدرسے" کے لفظ سے کسی مدرسے کے نام کی ابتدا، اس کے تازہ دم "بانیِ فاضل" کے نزدیک باعث توہین ہے؛ اس لیے کہ "مدرسے" کے لفظ سے تکثیر چندہ (جو اصل مقصود ہے) وہ حاصل نہیں ہو پاتی۔

ایک ضروری وضاحت

یہاں چندے اور دھندے کے مدرسوں کا تذکرہ زبان پر آ گیا ہے، تو اس سلسلے میں، میں کچھ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ آپ حضرات میری اِس گزارش سے کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ہمارے اکابر: حکیم الامت حضرت تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور ان کے باتوفیق رفقائے عمل و شرکائے فکر علماء و قائدینؒ، ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ اس ملک میں، چوں کہ حفاظتِ دین کی واحد شکل مدارس و مکاتب ہیں، اس لیے ملک کے طول و عرض میں ان کا جال پھیلا دینا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی گاؤں اور کوئی شہر ان کے وجود سے خالی نہ رہے۔

لیکن ان کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی شہروں اور قصبات میں ہی چندے کے بڑے مدرسے قائم ہوں اور ان کے لیے ہی عمومی چندے کی شکل اختیار کی جائے ؛ تاکہ قوم کے لیے ان کا تعاون بھی آسان ہو اور ان مدرسوں کی مرکزیت اور قوتِ کار بھی متاثر نہ ہو، بلکہ مزید ترقی کی منزلیں طے کرسکیں۔ اچھے علما، ذی استعداد فضلا، صاحب لیاقت دُعاۃ و مبلغین اور دور بیں قائدین کی کھیپ تیار کرکے، ملت کی دینی واجتماعی زندگی کے لیے، خونِ تازہ کی فراہمی کو یقینی بنا سکیں۔

اور گاؤں گاؤں اور شہروں کے مختلف محلوں میں زیادہ سے زیادہ دینی مکاتب قائم کیے جائیں ؛ جن کے مصارف، مقامی چندوں اور علاقے کے باغیرت مسلمانوں کے تعاون سے پورے ہوں۔ ان مکاتب میں قرآنِ پاک ناظرہ، درجۂ حفظ و تجوید، بنیادی اسلامی عقائد و تعلیمات، اردو زبان اور ضرورت کی حد تک دیگر مقامی زبانوں کے پڑھانے کا انتظام ہو۔ ان کے لیے عمومی چندے کی خدمت نہ لی جائے، بلکہ مقامی مسلمانوں کے دینی جذبے کو بیدار کرکے، ان سے ہی ان کے چلانے کے ذرائع پیدا کیے جائیں، کہ یہ شکل پائیدار بھی ہے اور ہر طرح کے طوفان و ہچکولے سے محفوظ بھی۔

اس سلسلے میں یہ تو ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی گاؤں یا کوئی علاقہ پچھڑا ہوا ہو اور وہاں کے لوگ بنیادی دینی تعلیم کے مکاتب کے لیے بھی چندہ دینے کے لائق نہ ہوں، تو اس کے لیے استثنائی طور پر عمومی چندے کی سوچی جاسکتی ہے۔

لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں سے، جو ناقص

الاستعداد علما کی ٹیم کی ٹیم پیدا ہو رہی ہے، وہ فراغت کے بعد جب میدانِ عمل میں قدم رکھتی اور حصولِ معاش کی راہ، اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے کچھ زیادہ روشن نہیں دیکھتی، تو وہ اپنی سہل انگاری کی بنا پر فوراً دو باتوں کا سہارا لیتی ہے:

۱- تعویذ، گنڈوں، جھاڑ پھونک اور شیاطین واَجِنّہ کے بھگانے کے دھندے کا۔

۲- تاسیس مدارس کا (جنھیں روزِ اول سے ہی "جامعہ" کے سابقے کے ساتھ بول کر اور لکھ کر جھوٹ بولنے جیسے گناہِ کبیرہ کا مسلسل ارتکاب کیا جاتا ہے)

اول الذکر گروہ میں سے جو لوگ دھندے کے طور پر یہ کام کرتے ہیں، میں نے یہ پایا ہے کہ عموماً وہ کسی نہ کسی جانی یا مالی پریشانی کا ہمیشہ کے لیے شکار ہو جاتے ہیں۔ ہاں گنتی کے چند لوگوں کو بظاہر معاشی کشادگی نصیب ہو جاتی ہے، جنھیں ان کے "ہم پیشہ" نگاہِ رشک سے دیکھتے اور زبانِ حال سے اِنَّهٗ لَذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ (وہ بڑے نصیبے والا ہے) کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔

ہمارے اکابر نے بھی بوقتِ ضرورت تعویذات لکھے ہیں، لوگوں کو دیے ہیں، لیکن وہ ان کی کوئی اجرت نہیں لیتے تھے۔ ذریعہ رزق بنانے کی بات تو بہت دور کی ہے۔

دوسرے گروہ کی حوصلہ مندی، کے طفیل اس وقت مدرسوں کی باڑھ آئی ہوئی ہے۔ رسیدوں، اشتہارات، کلنڈروں، البموں، تعارفی کتاب چوں "احوالِ واقعی" پر مشتمل رسائل کے حوالے سے، ان کے

درمیان ایک قسم کا ناپسندیدہ تنافس اور رسہ کشی، بلکہ طالع آزمائی پائی جاتی ہے۔ تکثیر چندہ کے لیے وہ کون سی مناسب ونامناسب تدبیر ہے جو کام میں نہ لائی جاتی ہو؟ اس سلسلے میں اتنے جھگڑے، رگڑے اور قصے قضیے وجود میں آتے رہتے اور سننے اور پڑھنے کو ملتے ہیں کہ اگر ان کو یک جا مرتب کردیا جائے تو "افسانے" کی بہترین کتاب بن سکتی ہے۔

ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ

جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز

اس صورتِ حال سے قومِ مسلم کی نگاہِ نارسا میں، علما کا جس طرح مقام گرا ہے اور گر رہا ہے؛ دین کا جس طرح وقار مجروح ہو رہا ہے؛ دینی شناخت رکھنے والے اشخاص کو جس طرح حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے؛ وہ ہم سب پر عیاں ہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال ہے۔ اِسی لیے حکیم الامت حضرت تھانویؒ پہلے تو چندے ہی کو ناپسندیدہ عمل قرار دیتے تھے، بعد میں انھیں کچھ شرح صدر ہو گیا تھا؛ لیکن وہ اس کی ہمت افزائی کے اخیر تک قائل نہ ہو سکے، بلکہ ہمت شکنی ہی کرتے رہے۔

جگر خوں ہو، تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

مدرسے کی کثرت اور کسی حد پر نہ رکنے والی رفتار نے "چندے" کے کام کو ایک گالی، تہمت "گناہ" اور باعث رسوائی عمل بنا کر رکھ دیا ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں، معاف

آج کچھ درد، مرے دل میں سوا ہوتا ہے

نتیجہ یہ ہے کہ قوم وملت کے بعض ضروری اور اہم کاموں کے لیے بھی، چندہ کرنے کا کام کٹھن اور ذلت آمیز سا ہو گیا ہے، کہ ملت کی نگاہ

میں یہ کام بالکلیہ فعلِ مذموم بن چکا ہے۔

حضرات!

یہ صورتِ حال ہم سے غور و فکر کی متقاضی ہے۔ ضروری ہے کہ اس مسئلے پر سر بر آوردہ قائدین و علمائے مفکرین، سنجیدہ غور و خوض کے بعد کوئی لائحۂ عمل مرتب کر کے "تاسیسِ جامعات" کے اس سیلِ بے پناہ پر بند باندھنے کی کوشش کریں اور "تاسیس مکاتب" کی فصل زیادہ سے زیادہ لگانے اور اسے ہری بھری رکھنے کے لیے، اپنی کسی کوشش سے دریغ نہ کریں۔

عزیز طلبہ!

یہ آپ کی منزل نہیں ہے کہ آپ آٹھ دس سالہ محنت شاقہ کے بعد ؛ دینی تعلیم اور شرعی علوم کی طرف نسبت گرامی کے حصول کے بعد ؛ والدین کی دعاؤں، تمناؤں اور تعلیمی مصارف کی فراہمی کے لیے مسلسل فکر مندی وسعی کے بعد ؛ اساتذہ کی نیک خواہشات، توجہات اور التفاتِ قلبی کے بعد ؛ شرکائے درس، رفقائے رہائش گاہ، اصدقائے تعلیم گاہ اور ندمائے سیر و تفریح کی محبت، پیار، اخلاص، اِیثار اور دراز وپُر بہار و یادگار نقش ہائے رفاقت کے بعد ؛ آپ کاسۂ گدائی لے کر یہاں وہاں اپنے آپ کو، اپنی شناخت کو، اپنے انتساب کو اور وقار و اعتبا کو مجروح کرتے پھریں۔ پھر آپ کی جھونی میں کبھی کوئی کچھ ڈال دے اور کبھی آپ محرومِ تمنا اور شرمسار واپس آجائیں۔ دین نا آشنا، خدا بیزار، علما کے مقام و مرتبے سے ناواقف، دنیا پرست اور دولت کے پجاری تاجروں اور کاروباریوں کے سامنے، دستِ سوال دراز کرتے پھریں اور وہ چاہیں تو

سگِ گرسنہ کی طرح آپ کی طرف "باسی روٹی" کا کوئی ٹکڑا پھینک دیں اور چاہیں تو مجرم سیہ کار کی طرح آپ کو دھتکار دیں!!

لاَ تَطلُبَنَّ مَعِیْشَۃً بِمَذلَۃٍ
وَ ارفَعْ بِنَفسِكَ عَنْ دَنِيْءِ الْمَطْلَبِ
تو شاہیں ہے ، پرواز ہے کام تیرا
اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
کہ تیرے زمان و مکاں لور بھی ہیں

آپ اپنے کو بنایئے سنواریے۔ عالی قدر اور کہکشاں صفت ہو جایئے۔ بڑی سے بڑی قیمت پر آپ تھوک دیجیے۔ "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کی صدا آپ کی ہیئت کذائی سے پھوٹتی ہو۔ لوگ آپ کی جوتیوں میں گریں، سرمایہ دار آپ کے قدم چومیں، اہلِ ثروت آپ کی بلائیں لینے کو آئیں، مال ودولت کے غلامانِ وفا کیش آپ پر زرو سیم لٹانا چاہیں اور آپ اپنے اکابر: نانوتوی، گنگوہی، مملوک علی، یعقوب، محمود، خلیل احمد سہارنپوری، تھانوی، اور مدنی کی طرح اس طرح بھاگیں جیسے لوگ کسی آفتِ ناگہانی سے بھاگتے ہیں۔

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

عربی کا کتنا سچا مقولہ ہے: نِعْمَ الأمیرُ علی باب الفقیر و بِئسَ الفقیر علی باب الأمیر ۔ آپ بِئسَ الفقیر کا مصداق نہ بنیے، یہ کوئی اچھی صفت نہیں۔ اگر آپ علامہ اقبال کے مطلوبہ معیار پر (جس میں

خدا بندے سے پوچھ کر ہی اس کی تقدیر رقم کرتا ہے) اپنی خودی کو بلند نہ کر سکیں، تو کم از کم اتنا تو کیجیے کہ بندے آپ کی کسی "تقدیر" میں دخل نہ دے سکیں اور آپ کی عظمت کو خریدنے سے قاصر ٹھہریں۔

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے، جاوداں ہو جا

برادران عزیز!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک بڑی عجیب اور بڑی اچھی صفت سے نوازا ہے: قوتِ ارادی؛ جس کے سامنے دریا، پہاڑ، صحرا، آب، باد، آتش: تمام مخلوقات الٰہی کی طاقتیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ پہاڑ اس کی ہیبت سے سمٹ کر رائی بن جاتا ہے اور صحرا و دریا اس کی ٹھوکر سے دو نیم ہو جایا کرتے ہیں۔

آپ صرف ارادہ کر لیں کہ آپ ذلت و بے اعتباری کی تمام صورتوں، مظان اور جائے وہم وگمان سے اپنے کو دور رکھیں گے اور حقارت کی کسی شکل سے آپ کبھی کوئی مصالحت نہیں کریں گے، پھر "قولِ مرداں جان دارد" کے اصولِ زریں کے مطابق آپ اس پر جم جائیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنے سلف کے سچے خلف اور اپنے پیش رو کے صحیح جانشین نہ بن سکیں۔

تو ہی ناداں! چند کلیوں پر، قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

آپ یقین جانیے کہ آپ کی صلاحیت اور صلاحیت کے ساتھ خودداری اور خودداری پر کاربند رہنے کے لیے قوت ارادی؛ نیز اپنے خدا

پر بھروسہ، اپنے نبی کی سیرت و کردار سے عشق، صحابۂ کرام کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی، علمائے دعوت و عزیمت کی سوانح کا استحضار؛ آپ کے معاشی اور دنیاوی مسئلوں کو بحسن و خوبی حل کردے گا۔

إذاَ صَحِبَ الفتیٰ جدٌّ وعزمٌ
تَحامَتْهُ المَکارِهُ والخُطُوبُ

اپنے رازق کو نہ پہچانے، تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے، تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

مربیِ یگانہ حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ فرماتے تھے کہ ہمیشہ اعلیٰ درجے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؛ کیوں کہ ادنیٰ اور اوسط استعداد والوں کی دنیا میں مانگ نہیں ہوتی۔ اُنھیں دنیا نظر انداز کرجاتی ہے۔ آپ مثلاً: ایک نمبر خوش نویس ہی بن جایئے؛ ایسے مقرر بن جایئے کہ ربیع الاوّل کا کوئی جلسہ آپ کی تقریر کے بغیر نامکمل رہے؛ تو لوگ، باوجود بھگانے کے، آپ کے پاس آئیں گے۔ باصلاحیت کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ بے صلاحیت کے متعلق کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

☆ ☆ ☆

(۶) چھٹی چیز: عبارت کو از روئے قواعدِ نحو صرف پڑھنی اور لکھنی ہے۔ یہ سب سے اہم بات ہے۔ ہمارے اساتذہ فرماتے تھے کہ عربی دوم کے بعد، عبارت کی صرفی و نحوی غلطی ایک ناقابلِ معافی جرم ہے؛ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت یہ جرم اتنا عام ہوچکا ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی طالبِ علم "بے گناہ" نظر آتا ہے۔

عبارت کو صرفی ونحوی غلطی سے پاک کرنے کا طریقہ

برادرانِ عزیز!

عبارت کو صرفی ونحوی غلطی سے بے عیب کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ صرف، نحو کے قواعد کو دقتِ نظر سے پڑھا جائے، اُنھیں زبانی اچھی طرح سمجھ کر یاد کیا جائے، پھر ہر قاعدے کی عبارت میں عملی مشق کی جائے۔ پہلے طلبہ کو اساتذہ، شرح مائۃ عامل میں قواعد کی اچھی مشق کرادیتے تھے؛ کیوں کہ "نحو میر" کے بعد ہی شرح مائۃ پڑھائی جاتی تھی، اس میں جہاں عوامل کو گرفت میں لانے پر زور دیا جاتا تھا اور نحوی ترکیب کی بصیرت پیدا کی جاتی تھی، وہیں اس کی عبارت سے یہ فائدہ اٹھایا جاتا تھا کہ ہر لفظ، نہیں تو کم از کم ہر سطر میں ایک دو لفظ پر اساتذہ، طلبہ سے پوچھتے جاتے تھے کہ بتایئے یہ نحوی اعتبار سے کیا واقع ہے اور صرفی اعتبار سے اس کی کیا پوزیشن ہے؟ اس طریقِ تدریس کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ طلبہ درجہ دوم عربی کی تکمیل کرتے کرتے ہی عبارت پر قابو پالیتے تھے اور مشکل تھا کہ کسی طالبِ علم سے درجہ عربی سوم میں پہنچ کر کوئی غلطی، نحوی یا صرفی دائرے کی سرزد ہو۔ ہاں اِس قاعدے سے وہ طلبہ، جن کی تعداد بہت کم ہوتی تھی؛ مستثنیٰ ہیں جو پیدائشی طور پر اتنے "مستقل مزاج" پیدا ہوتے ہیں کہ وہ تاثر کی تمام صلاحیتوں سے مقابلے کے "صلاحیت" کے مالک ہوتے ہیں۔ اُنھیں تعلیم وتربیت کا کوئی سا نسخہ "راس" نہیں آتا اور پند ونصیحت کی زود تراثر والی کوئی دوا بھی ان کے مزاج ومذاق کی تبدیلی کے عمل میں ناکام ثابت ہوتی ہے؛ کیوں کہ

اس طرح کے "باکمال" طلبہ یہ طے کر کے بیٹھتے ہیں کہ کسی فاضل سے فاضل استاذ، قابل سے قابل مدرس اور پُر درد مربی سے مات نہیں کھانی ہے اور دیکھتے ہیں: کون مائی کا لال ہے، جو ہمیں اپنی خو چھوڑنے اور اپنی وضع تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتا ہے!!۔

برادرانِ عزیز!

اس طرح کے طلبہ سے، بدقسمتی سے ہم لوگوں کو بھی سابقہ رہا ہے اور میں اور میرے رفقائے تدریس ہمیشہ ان سے "ہار" مانتے رہنے کو اپنی "سعادت" سمجھتے رہے ہیں۔ مجھ پر "حوصلہ شعاری" کا ایک عرصہ ایسا گزرا ہے کہ اس طرح کے طلبہ سے پند و نصائح کے "ترقی یافتہ" ہتھیاروں کے کند ہونے تک "جنگ آزما" رہتا تھا لیکن اب ہتھیاروں کو زیادہ کچھ آزمائے بغیر ہی، ہار مان لیا کرتا ہوں کہ عمرِ رواں کے قافلۂ تیز رو کے تجربات نے اِسی سبق کو یاد رکھنے کی تلقین کی ہے۔

ماضی میں طلبہ کی صرفی ونحوی پختگی کی ایک اور وجہ

قواعد پر عبور، صرفی ونحوی غلطی سے نجات، اور عربی عبارت کو صحیح صحیح پڑھنے اور لکھنے کا چسکا پیدا کرنے میں اس بات کو بھی دخل ہوا کرتا تھا کہ صاحبِ دل اور شب زندہ دار اساتذۂ گرامی، طلبہ کے دلوں میں کتابِ الٰہی، حضورِ اکرم (ارواحنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسلام کی قانونی زبان ہونے کے حوالے سے؛ عربی زبان کی محبت اس درجہ جاگزیں کر دیتے تھے کہ اس کے قواعد کو یاد کرنے، اس کی صرف ونحو کو رٹنے، اس کو اپنے قلم سے لکھنے، اپنی زبان سے پڑھنے اور اس کو صحیح صحیح ادا کرنے

میں ایسا روحانی لطف ملتا تھا، ایسا معنوی کیف محسوس ہوتا تھا اور ایسی ذہنی لذت ملتی تھی کہ اس کی بنا پر اس سلسلے کی تمام کلفتیں شیریں اور تمام مشقت آمیز محنتیں آسان معلوم ہوتی تھیں۔ اساتذہ شدہ شدہ، روزانہ کی گفتگو اور پند و نصائح کے ذریعے، (جن میں ان کے عمل اور ان کی خدا شناس وتقویٰ شعار زندگی اور عبادت و ریاضت نے ساحرانہ تاثیر پیدا کر دی ہوتی تھی) طلبہ کے قلب وذہن میں، عربی زبان کی شناخت ایک مقدس زبان کی حیثیت سے، قائم کر دیتے تھے، جس کا حصول اور اس سلسلے کی محنت گویا عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

افسوس ہے کہ یہ صورتِ حال اب ختم ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ خدا کے بندوں کے ذہن و قلب میں عربی زبان کے حوالے سے یہی جذبات ہوں؛ لیکن تجربے نے بتایا کہ اب لوگ عربی کو ذریعۂ معاش کے طور پر ہی حاصل کرتے ہیں؛ اس لیے اس کے حصول کی کوششیں اب کیف آور اور لذت انگیز و روح افزا نہیں رہیں۔

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے، تو فرمایا:
ترا مرض ہے، فقط آرزو کی بے نیشی

دوسری وجہ

طلبہ کے عربی عبارت کی رگوں سے، جلد واقف ہو جانے میں اس بات کو بھی دخل ہوا کرتا تھا کہ اساتذہ عربی ہی میں اور بدرجۂ مجبوری فارسی میں (جس کا چلن مدرسوں کی سطح تک بیس پچیس برس قبل تک بڑی حد تک باقی تھا) حاشیہ یا شرح دیکھنے کی اجازت دیتے تھے۔ اپنے

کمرے میں بھی طلبہ کو اس کی اجازت نہ ہوتی تھی کہ وہ اردو میں حاشیہ یا شرح دیکھیں۔ درجہ سوم اور چہارم تک تو اس سلسلے میں سخت پابندی کرائی جاتی تھی۔ اردو اخبار پڑھنے سے بھی اِس مرحلۂ تعلیم تک پرہیز کرایا جاتا تھا۔ ہمارے اساتذہ اس سلسلے میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ کمرے میں چھپ کر بھی کوئی طالب علم اردو شرح یا اردو حاشیہ والی کتاب کا مطالعہ کرتا اور ان کے علم میں یہ بات آجاتی، تو "ضربِ تادیبی" سے باز نہ آتے تھے۔ اسی طرح جلسوں، جلوسوں، مشاعروں، تفریح کی تقریبات میں شرکت بالکلیہ ممنوع تھی کہ اس سے مطالعہ، مذاکرہ (تکرار) اور علم کوشی، جو طلبہ کا اصل کام ہے؛ میں خاصا خلل واقع ہوتا ہے۔ کسی جلسے یا مشاعرے میں دیر رات تک جاگ جایئے، تو ایک تو مطالعے کا ہرج ہوتا ہے، دوسرے صبح کو درجے میں انسان چستی کے ساتھ سبق سننے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔

ایک دلچسپ وسبق آموز واقعہ

اس سلسلے میں ایک واقعے کا تذکرہ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا:

ہم لوگ درجہ دوم عربی کے، دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں، طالبِ علم تھے۔ اتفاق سے وہاں سے قریب کے قصبے "کوپاگنج" میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب متوفی ۱۴۰۳ھ نور اللہ مرقدہ، کی کسی موضوع پر دراز نفس تقریر کا طلبہ کو علم ہوا کہ وہ آج شب سے شروع ہوگی اور کئی راتوں تک جاری رہے گی۔ پہلی ہی شب کو یا دوسری

شب کو دار العلوم اور مفتاح العلوم کے بہت سے طلبہ کے ساتھ، ہمارے درجے کے بھی چند طلبہ قاری صاحبؒ کو سننے کے لیے چلے گئے اور صبح کو درجے کے وقت سے پہلے ہی آ گئے۔ ہمارے استاذِ گرامی مولانا نذیر احمد صاحب مئوی مد ظلہ جو جلسے وغیرہ میں طلبہ کی عدم شرکت کے سب سے بڑے داعی تھے دار العلوم مئو میں، کو اس بات کا کسی طرح علم ہو گیا کہ فلاں فلاں طالبِ علم، ان کے درجے کے رات "کوپاگنج" کے جلسے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اُنھوں نے ان طلبہ سے بطورِ خاص سابقہ سبق سنانے اور عبارت پڑھنے کو کہا۔ ظاہر ہے کہ وہ نہ تو سبق سنا سکے اور نہ ہی عبارت صحیح پڑھ سکے؛ ایک دو نے کچھ صحیح پڑھا بھی؛ لیکن ان کی خواندگی سے عدمِ مطالعہ کی غمازی ہوتی تھی۔ بہر صورت اُنھوں نے ہر ایک کی خوب خبر لی اور فرمایا کہ دیکھیے آپ لوگ بجائے اس عمر میں جلسے میں جانے کے حتی کہ قاری صاحب کو سننے کے، کوشش کیجیے کہ آپ سبھی لوگ "قاری طیب" بن جائیں کہ لوگ آپ کو دیکھنے، سننے اور آپ سے استفادے کے لیے دور دور سے جوق در جوق آئیں۔ اور یہ چیز اس محنت کے بغیر ناممکن ہے، جو قاری صاحب اور ان کی جیل کے لوگوں نے کی تھی!

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل!
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

☆ ☆ ☆

(۷) ساتویں بات لہجے کی پابندی ہے۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ کسی زبان کو ممکن حد تک اسی طرح بولا اور پڑھا جائے اور زیر و بم، اتار چڑھاؤ

اور آواز و جرس میں اسی طرز کو اپنایا جائے جو اہلِ زبان کے نزدیک معمول بہ ہے۔ یہ چیز نمبر (۴) کے تحت بیان کردہ صحتِ تلفظ و ادا سے الگ بات ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک باکمال قاری بھی ہمارے برصغیر کا، صحتِ ادا و تلفظ اور تمام قراءات وغیرہ پر عبور رکھنے اور اُنھیں عملی طور پر برتنے کے باوجود؛ ہندی لہجے کی جکڑبندی یا عجمی رنگ و آہنگ کے طوق و سلاسل سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کرپاتا؛ چناں چہ جب کسی محفل میں حتی کہ غائب از نظر صورت میں ریڈیو پر بھی اسے سنیے، تو اپنے صوتی امتیاز اور لہجاتی شناخت کی وجہ سے ایک سامع یہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ قاری، برصغیر کا یا کسی خطۂ عجم کا باشندہ ہے اور اپنی تمام فن کارانہ صلاحیتوں اور علمِ تجوید و قراءت میں درجۂ اختصاص کے باوجود، اپنی خاک کے خصائص سے "بے وفائی" برتنے کی جرأت نہیں کرسکا ہے۔

اگر آپ اہل زبان نہیں ہیں تو آپ کو اس زبان کے لہجے کی نقل میں کچھ عرصے تک تکلف آمیز محاکات کرنی ہوگی۔ اگر وہ زبان عربی ہے تو اس کے ساتھ محبت کے بہت سارے طاقت ور محرکات کی وجہ سے اس تکلف، تصنع اور بناوٹ میں بھی آپ کو لطف آئے گا؛ جیسا کہ پیچھے اشارہ کیا گیا، کہ محبت خود سکھا دیتی ہے آدابِ محبت بھی۔ آپ کا یہ احساس کہ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن کے لوگ، جس طرح بولتے ہیں اسی طرح عربی بولنی چاہیے: وہ کسی لفظ کو دباتے ہیں تو دبانا چاہیے، چباتے ہیں تو چبانا چاہیے، کھینچتے ہیں تو کھینچنا چاہیے، عُجلت سے ادا کرتے ہیں تو اسی عُجلت کی نقل کرنی چاہیے، کسی لفظ کو کسی خاص انداز سے بولتے ہیں تو اسی انداز کی تقلید کرنی چاہیے، کسی حرف یا لفظ میں لہجے میں نرمی

ہوتی ہے تو وہ نرمی میری زبان میں بھی پیدا ہونی چاہیے، کسی حرف یا لفظ میں آواز بھاری بھرکم بن جاتی ہے، تو ہمیں بھی اسی طرح اسے بھاری بھرکم کرنی چاہیے ؛ آپ کا یہ مبارک احساس آپ کو محاکات پر آمادہ کیے بغیر نہ رہ سکے گا۔

عربی کو عربوں کے لہجے میں بولنے کی مشق کا طریقہ

یہاں قدرتی طور پر آپ پوچھیں گے کہ عربی زبان کو عربوں کے لہجے میں بولنے کے لیے تو عربوں سے اختلاط اور ان کے ساتھ ایک معتدبہ عرصہ گزارنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو ان کے لہجے کی پیروی خارج از امکان چیز معلوم ہوتی ہے۔

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اصل طریقہ عربی زبان کے لہجے کو سیکھنے کا تو واقعتاً یہی ہے کہ کچھ عرصہ عربوں کے درمیان گزارا جائے، خصوصاً پڑھے لکھے عربوں کے ساتھ ؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہندوستان کے تمام عربی سیکھنے والوں کے لیے تو کیا، صرف آپ کے اس ایک مدرسے کے تمام عربی زبان کے طلبہ کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ سبھی لوگوں کو ضرور عرب جاکر، وہاں معتدبہ عرصے تک عربوں سے ان کی زبان، ان کے لہجے اور آہنگ میں سیکھنے کا موقع مل جائے۔

یہ قرونِ ماضیہ کی برکتیں تھیں کہ ایک پر شوق سیاح، ایک حوصلہ بدوش طالبِ علم، ایک علم کا رسیا مؤرخ یا محقق، ایک شہیدِ جستجو فقیہ اور محدث ؛ اپنے اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتا تھا۔ جس ملک میں جتنے دنوں چاہتا تھا رہتا

تھا۔کسی بات کی کوئی پابندی نہ تھی،اس طرح کے کام کے لیے حدود و ثغور کا کوئی مسئلہ نہ تھا، قومیت، جنسیت،رنگ و نسل، عصبیت،اقلیت واکثریت،پاسپورٹ، ویزا،شناختی کارڈ، امیگریشن،سیکورٹی چیکنگ آمدورفت (دخول خروج) کی ریکارڈنگ وغیرہ کے جھگڑے نہیں تھے۔ایک مسافر "ہر ملک، ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" کے خوش گوار احساس بلکہ مبارک یقین کے ساتھ ،جہاں چاہے چلا جاتا تھااور زادوراحلہ کی عدم دست یابی کے علاوہ اس کے سامنے دنیا کے کسی ملک میں جانے کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تھی(۱)انسان کی شناخت اور اس

---

(۱) دنیا کا مشہور مسلم سیاح ابن بطوطہ (محمد بن عبداللہ) (۱۳۰۴ء-۱۳۷۷ء) مغرب عربی (مراکش) کے ایک شہر "طنجہ"(Tanger) سے اٹھتا ہے اور پوری دنیا کے گوشے گوشے کی خاک چھان ڈالتا ہے۔اس نے ۲۹سال تک سیاحی کی۔ تین بڑے بڑے سفر کیے اور اپنے وقت کی معلوم دنیا کے کسی بھی قابل ذکر علاقے کو دیکھے بغیر نہیں چھوڑا۔وہ مصر،شام، فلسطین، حجاز، عراق، فارس، جنوبی عرب کے ممالک، مشرقی افریقہ ،ایشیائے کوچک، جزیرہ نمائے قریم، بلاد خوارزم، بخاری، افغانستان، چین، ہندوستان : ہر جگہ گیا اور وہاں معتد بہ عرصہ گزار کر وہاں کی تہذیب، تمدن، ثقافت، زبان، عادات، روایتوں، مذاہب، حالات وواقعات، آثار قدیمہ، حکومتوں کا عروج وزوال، اشیا کی قیمتیں، وہاں کی اجناس وغلہ جات، لباس وپوشاک، رہن سہن : ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور اس کو اپنی ڈائری (سیاحتی کتاب بنام "تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاخبار) میں ریکارڈ کرکے دنیا کے انسانوں کے لیے معلومات کا خزانہ فراہم کردیا۔ جس کا ترجمہ دنیا کی اہم زبانوں میں ہوچکا ہے، خصوصاً فرانسیسی، جرمنی، اور انگریزی زبانوں میں۔وہ قدیم ہندوستان کے وسیع وعریض علاقے سے اپنے سفر کو سمیٹتا ہوا براہ "سوماترا"(Sumatra) (انڈونیشیا کا سب سے بڑا جزیرہ) بلاد عرب ہوتا ہوا اپنے ملک مراکش کو لوٹا۔ نہ کسی نے بطاقۃ الھویۃ (شناختی کارڈ) مانگا اور نہ کسی نے الجواز (پاسپورٹ) طلب کیا، نہ ہی کسی ملک سے نکلتے وقت دخول وخروج (آمدورفت) کی تسجیل اور رجسٹریشن کی ضرورت ہوئی۔

اسی طرح ابن جبیر اندلسی (محمد بن احمد) (۱۱۴۵ء-۱۲۱۷ء) اندلسِ مرحوم کے شہر "بلنسیہ"

(باقی اگلے صفحے پر)

پر اعتماد اس کے چہرے مہرے، اس کی شکل و صورت اور اس کے خد و خال سے کی جاتی تھی۔ کاغذی دستاویزات کے ذریعے اس کے انسان یا شیطان ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ اوراق کی روشنی میں یہ طے نہیں ہوتا تھا کہ وہ کرۂ ارض کا باشندہ ہے، یا افلاک سے خاک پر تازہ بتازہ وارد ہوا ہے، نیز یہ کہ انسان ہے یا کوئی اور خلائی، فضائی، بحری یا بری مخلوق : چناں چہ اگر کاغذات میں کسی طرح کا ادنی سا ابہام ہو، یا متعلقہ بد نیت یا بد خلق اربابِ حل و عقد کی طرف سے ابہام پیدا کر لیا جائے، تو ایسی صورت میں

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ)

(Valencia) سے رخت سفر باندھتا اور اسکندریہ، قاہرہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، موصل، حلب، دمشق، عکا، جزیرۂ صقلیہ (Sicilia) وغیرہ : ہر جگہ گھوم آتا ہے اور اپنے تاثرات واحساسات وملاحظات کو اپنے سفر نامہ موسوم بہ "رحلۃ ابن جبیر الاندلسی" میں ہمارے آپ کے لیے محفوظ کر جاتا ہے۔

لیکن وہ جس خطے میں چاہتا ہے آزادانہ چلا جاتا ہے۔ انسان ہے انسانوں کی بستی میں کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم کون ہو کیا ہو، کیوں کر ہو، کس لیے ہو، تمہارا وجود بھی ہے کہ نہیں؟ لاؤ کاغذات تاکہ تمھارے ہونے نہ ہونے یا تمھارے حیوانات، نباتات، اور جمادات میں سے کسی "موزوں" قسم میں داخل کیے جانے کا فیصلہ کیا جا سکے!!

شیخ سعدی شیرازی (مصلح الدین) (۱۱۹۲ء - ۱۲۹۱ء) جو ہمارے مدارسِ عربیہ کی جانی پہچانی بابرکت و مقدس شخصیت ہیں، جن کی کتابیں گلستاں و بوستاں (دنیا کی علم و حکمت کی مشہور ترین کتابوں میں سے دو کتابیں) عرصے تک ہمارے نصاب کا جزو لاینفک رہی ہیں، جنوب مغربی ایران کے شہر "شیراز" کی خاک سے پیدا ہوتے ہیں، علم و عمل کی سپہ گری، عقل و خرد کی لشکر کشی اور عشق و محبت کی آتش بازی میں یگانہ بننے کے بعد، ملکوں ملکوں کی سیاحی کرتے ہیں۔ ہندوستان آتے ہیں تو یہاں کی رنگینی و بو قلمونی اور ہندی تہذیب کی سحر کاری انھیں گرویدہ بنا لیتی ہے اور علم و حکمت کی اس تجربہ گاہ میں وہ سالہا سال رہ جاتے ہیں۔ لیکن کسی ملک میں کوئی ان سے ان کی شخصیت کی سند، انسانیت کا شہادت نامہ اور ابن آدم ہونے کا نسب نامہ نہیں مانگتا۔

(باقی اگلے صفحے پر)

تادمِ ازالۂ ابہام، حاملِ کاغذات کو بین بین مخلوق سمجھا جاتا ہے، بلکہ بعض دفعہ "بطورِ احتیاط" بے زبان چوپایہ یا دوپایہ جانور ہی باور کرلیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ خدا کی اسی مظلوم مخلوق کا سا معاملہ روا رکھا جاتا ہے!!۔

دو پرلطف واقعے

یہاں ایک دو واقعے کا تذکرہ عبرت سے خالی نہ ہوگا:

جامعۃ الملک سعود میں عربی زبان کی تدریس کے ایک سہ ماہی کورس میں شرکت کے لیے، جمادی الاولی ۱۴۰۳ھ مطابق فروری ۱۹۸۳ء میں، میرا پہلی مرتبہ عالمِ عربی کا سفر ہوا۔ اس پروگرام میں شرکت کے لیے ہندوستان سے میرے ساتھ عربی زبان وادب کے پانچ چھ اساتذہ اور بھی

(صفحہ گذشتہ کا بقیہ)

ہمارے محدثین وفقہا کے طویل طویل اسفار، ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لیے صحرا نوردی اور ایک ایک مسئلے کی چھان بین کے لیے بادیہ پیمائی: ہماری علمی، دینی، عقائدی، فکری اور ثقافتی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے، جن کے قصے ہم نگاہِ عقیدت سے پڑھتے ہیں، دل کے کانوں سے سنتے ہیں، محبت بھری زبان سے دہراتے ہیں، خوش ہوتے ہیں، اور ہمارے سینے جذباتِ افتخار واعزاز سے پُر ہو جاتے ہیں۔

کیا آپ نے سنا ہے، پڑھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کو فلاں ملک کی سرحد پر روک لیا گیا؟ امام شافعیؒ کی فلاں چوکی پر تلاشی لی گئی، امام مالک کو امیگریشن والوں نے دیر تک روکے رکھا، امام احمد کو فلاں ملک کے سیکورٹی عملے نے بہت زچ کیا، یا امام بخاری ومسلم کو فلاں شہر کی فصیل سے باہر پوری ایک رات اس لیے گزارنی پڑی کہ "کاغذات" ناقص تھے!

کتنا اچھا زمانہ تھا، کیسا خوب صورت دور تھا، کیسی آزادی تھی (آزادی کے کسی نعرے کے بغیر!) انسانوں کی انسانیت کا گریبان ودامن کس درجہ محفوظ تھے؟!

یاد ماضی عذاب ہے یارب!

شریکِ قافلہ تھے۔ میرے ایک ساتھی کی داڑھی پاسپورٹ والی تصویر میں کھچڑی تھی؛ لیکن ان کے چہرے پر وہ مکمل سپید ہو چکی تھی۔ پاسپورٹ موجودہ دس سال والی مدت سے پہلے ابھی دو تین سال پہلے تک، پانچ سال کے لیے بنا کرتا تھا، پھر پانچ سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے پہلے مزید پانچ سال کے لیے تجدید ہو جایا کرتی تھی، اس طرح گویا پاسپورٹ دس سال کے لیے ہوا کرتا تھا۔ اب اگر کسی کی داڑھی دس یا آٹھ سال پہلے کھچڑی تھی تو یقیناً اس کا امکان موجود ہے کہ اب داڑھی کے بال سفید ہو جائیں اور مولوی صاحب مذکور تو نزلاوی مزاج کے بھی تھے؛ اس لیے اُن کی داڑھی اور بھی جلدی سفید ہو گئی تھی۔

اتنی موٹی سی بات، امیگریشن پر تعینات موٹی مونچھ والے، فرعون صورت، قبیح شکل، سرخ چشم، مجسمۂ خودسری و غرور اور عاری از انسانیت ملازم کو، پالم انٹرنیشنل ہوائی اڈے پر (جو اب اندرونی پروازوں کے لیے مختص ہو گیا ہے؛ کیوں کہ اب اندرا گاندھی انٹرنیشنل ہوائی اڈے کے نام سے، اس سے بڑا ہوائی اڈہ بن چکا ہے) سمجھ میں نہیں آئی، بلکہ اس نے نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ اس نے خاصی دیر تک ہم لوگوں کو روکے رکھا، ہم لوگوں کی تمام معقول باتوں کو اپنی ہٹ دھرمی سے رد کرتا رہا۔ خطرہ تھا کہ ہم لوگوں کا جہاز چھوٹ جائے، ہم لوگ خدانخواستہ کئی روز کے لیے رکے رہ جائیں اور نتیجتاً مذکورہ پروگرام میں شرکت بھی غیر یقینی بن جائے۔ دس پندرہ منٹ فلائٹ کی روانگی میں رہ گئے تھے کہ اچانک امیگریشن کا اس سے بڑا ملازم، غالباً ہم لوگوں کی دیر سے موجود بھیڑ کو دیکھ کر، ادھر کو آنکلا۔ اس نے ہم لوگوں کو فوراً چھوڑ

دیا کہ آپ لوگ جلدی کیجیے آپ کی فلائٹ روانہ ہوا چاہتی ہے اور ابھی سیکورٹی چیکنگ بھی باقی ہے۔

اس سے دلچسپ واقعہ میرے ساتھ یہ پیش آیا کہ ایک سفر میں ریاض انٹر نیشنل ہوائی اڈے پر دخول (انٹری) درج کرنے والے ملازم نے، میری داڑھی اور دینی شکل وصورت سے کسی نتیجے تک نہ پہنچ کر؛ مجھ سے عجب سا یہ سوال کیا کہ "هل أنت مسلم" میں نے فوراً ہی کہا "الحمد لله أنا مسلم سنيّ" لیکن اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ اس کو میرے کہنے پر خاطر خواہ یقین نہیں ہے؛ چنانچہ میں نے فوراً ہی اپنا پاسپورٹ بڑھا دیا، جو اس کو دیکھنا ہی تھا، تو کہنے لگا: "صحيح أنك مسلم"!!.

اس طرح کے کئی واقعات میرے اور دوسروں کے ہیں: پڑھے ہوئے بھی اور سنے ہوئے بھی؛ لیکن کہاں تک ذکر کیا جائے۔

مدارس کے ذمے داروں سے گزارش

خلاصہ یہ کہ آپ میں سے ہر ایک کے لیے عالم عربی جانا اور وہاں تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اگر ممکن ہو سکے تو کم از کم زبان کی حد تک اس سے بہتر کوئی صورت نہیں۔

ہاں، بصورتِ دیگر آپ یہ کر سکتے ہیں کہ پابندی سے عالم عربی کا ریڈیو سنا کریں، خبریں، تقریریں، اور شعری وادبی مضامین بھی، جو وہ اکثر نشر کرتا ہے۔ خصوصاً سعودی عرب کا مکہ مکرمہ کے اسٹیشن سے نشر کردہ پروگرام، کہ یہ آپ کے لیے موزوں وقت ہے یعنی دس بجے رات

کے آس پاس کا وقت۔ اس اسٹیشن سے خبریں اور دینی تقریریں وغیرہ بھی آپ سن سکتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں آپ کو شاید، مدرسے کے ذمہ داروں کی طرف سے ممانعت اور حوصلہ شکنی کا سامنا کرنا پڑے، کہ وہ مدرسے کے طلبہ کو ریڈیو رکھنے سے منع کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان کی مجبوری یہ ہے کہ عام طلبہ اس سے صرف گانا اور مخرب اخلاق پروگرام ہی سنتے ہیں۔ ان کے لیے چوں کہ انتظامی طور پر استثنا مشکل ہے، اس لیے وہ عمومی حکم نامے کے ذریعے سبھوں کو اس سے منع کر دیتے ہیں۔

اب اس سلسلے میں آپ کے مدرسے سے اور ان تمام مدرسوں سے، جو عربی زبان کی افادیت پر یقین رکھتے ہیں، گزارش ہے کہ وہ اپنے طور پر، کسی ہال یا کمرے یا درس گاہ میں، کسی متعلقہ استاذ کی نگرانی میں، عالم عربی سے نشر کردہ مذکورہ بالا قسم کے پروگراموں، کو سننے کا بندوبست کریں؛ تاکہ طلبہ فائدہ اٹھا سکیں۔

نیز عالم عربی میں اب ادب، شعر، بچوں کے ادب، فقہ، حدیث، اور تمام نصابی کتابوں کی اچھے لب و لہجے میں پڑھنے والوں سے پڑھوا کر، کیسٹیں بنوالی گئی ہیں۔ عبدالرحمٰن رافت الباشا کی مشہور ترین نصابی ادبی کتاب "صور من حياة الصحابه" عرصہ قبل کیسٹ میں آچکی ہے، قرآن پاک مکمل مختلف قاریوں کا پڑھا ہوا، کیسٹ کی شکل میں حرمین اور تمام عالم عربی میں دست یاب ہے۔ نیز شعلہ نوا مقرروں، جادو طراز واعظوں، ایمان افروز مفکروں اور علماء و مبلغین کی تقریروں کے کیسٹ بھی بلاد عربیہ میں میسر ہیں، بلکہ اب کیسٹوں کے "المكتبات السمعية"

یا "المکتبات الصوتیۃ" کے نام سے، چھپی ہوئی کتابوں کی طرح بڑے بڑے مکتبے قائم ہو چکے ہیں۔ عالم عربی میں سالہا سال سے طلبۂ مدارس وجامعات کو، ان چیزوں سے مستفید ہونے کا موقع، اعلی پیانہ پر فراہم ہے اور اس میں حالات وترقی کے ساتھ ساتھ مزید پیش قدمی ہو رہی ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے مدارس کے ذمہ داران، خصوصاً مرکزی مدارس کے اربابِ حل وعقد؛ اِن چیزوں کو فراہم کریں اور اچھے قسم کے ٹیپ ریکارڈوں کا نظم کر کے، اپنی نگرانی میں باقاعدہ طور پر طلبۂ عزیز کی اس سلسلے کی علمی وفکری پیاس کے بجھانے کا، حوصلہ مندانہ اقدام کر کے، مبارک باد کے مستحق بنیں۔

ہماری طالبِ علمی کے زمانے میں، دارالعلوم دیوبند میں، دارالعلوم کی طرف سے، عشاء کی نماز کے بعد ہر جمعرات کو، قاری عبدالباسط صاحب کی قراءت کے کیسٹ طلبہ کو سنائے جاتے تھے۔ کتنے طلبہ نے ان کے ذریعے قرآنِ پاک کو صحیح پڑھنے اور خوب صورت انداز میں تلاوت کرنے کا سلیقہ وطریقہ سیکھا۔ طلبہ ایک معتدبہ تعداد میں، باقاعدہ کیسٹ کی آواز کے ساتھ ساتھ اس طرح اپنی آواز ملاتے جاتے تھے، جیسے گویا وہ کسی قاری صاحب کے سامنے بیٹھ کر، ان کی نقل کر رہے ہوں۔ یہ انتظام دارالحدیث تحتانی میں ہوا کرتا تھا۔ پر شکوہ ہال، دارالعلوم کی علمی وروحانی فضا، ایک خوش الحان عربی نژاد، زبان کے ادا شناس، نزاکتِ لب ولہجے کے شناور قاری کی قراءت اور کتاب اللہ کی جلالتِ شان: ان سب باتوں کے گھل مل جانے کی وجہ سے ایک عجیب پُر کیف سماں پیدا ہو جاتا تھا۔

عِیْدٌ وَعِیْدٌ وَعِیْدٌ صِرنَ مُجْتَمِعَۃً
وَجْہُ الْحَبِیْبِ وَیَوْمُ الْعِیْدِ وَالْجُمُعَۃ

سامعین کرام!

طویل سمع خراشی کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں اور ان ہی مد گزارشات پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ وقت بھی بہت زیادہ ہو چکا ہے، ابھی عشاء کی نماز بھی پڑھنی ہے اور آپ کے چہروں سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہیں۔ فآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

INDEX

شخصیات

الف

ب ج ح خ

ر س ش ع غ

کنایات، اِدارے، اصطلاحات، زبانیں اور مقامات

مولانا نور عالم خلیل امینی

ادارہ علم و ادب، دیوبند۔ یوپی
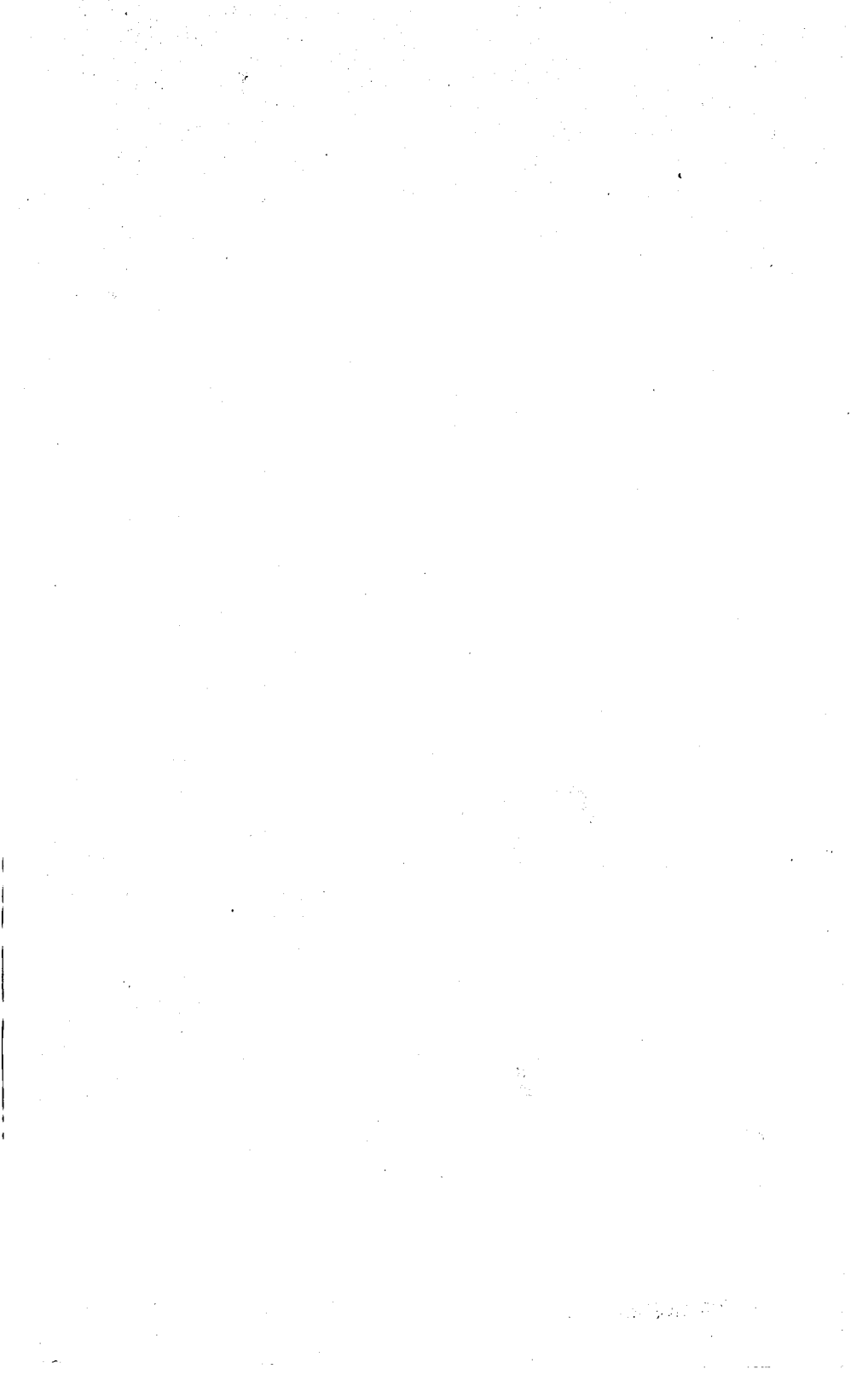
عربی زبان کی اہمیت، اس کو تحریراً و تقریراً سیکھنے کے طریقوں، جملہ نگاری سے مضمون نگاری تک کی منزلوں، عربی کو عربوں کے لہجے میں بولنے کی تدبیروں، خوش خطی کے فوائد، بدخطی کے نقصانات، تحریر کی مختلف شکلوں کے حوالے سے علمائے نفسیات کے اخذ کردہ نتیجوں، عربی اور اُردو میں عصرِ حاضر میں استعمال کردہ رموزِ اوقاف، عربی میں ہمزے کی کتابت کے ضروری فوائد و امثال، عربی عبارت کو صرفی و نحوی غلطی سے پاک کرنے کی راہوں کی دلچسپ، پُر لطف اور برجستہ انداز میں نشان دہی کی گئی ہے۔ اِس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ زبان و ادب کے تمام شائقین کے لیے ایک تحفہ، پیغام اور ناگزیر ضرورت ہے۔

قابلِ ذکر ہے کہ پوری کتاب میں رموزِ اوقاف اور قواعدِ املا کو دقتِ نظر سے (گو کہ مخلوق کا کوئی کام مکمل طور پر عیب سے خالی نہیں ہو سکتا) برتنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب، اس حوالے سے بذاتِ خود معلّم کا کام دے سکتی ہے۔

ادارۂ علم و ادب

قریشی منزل قدیم، دیوبند (یو،پی)